قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا چوہترواں سال

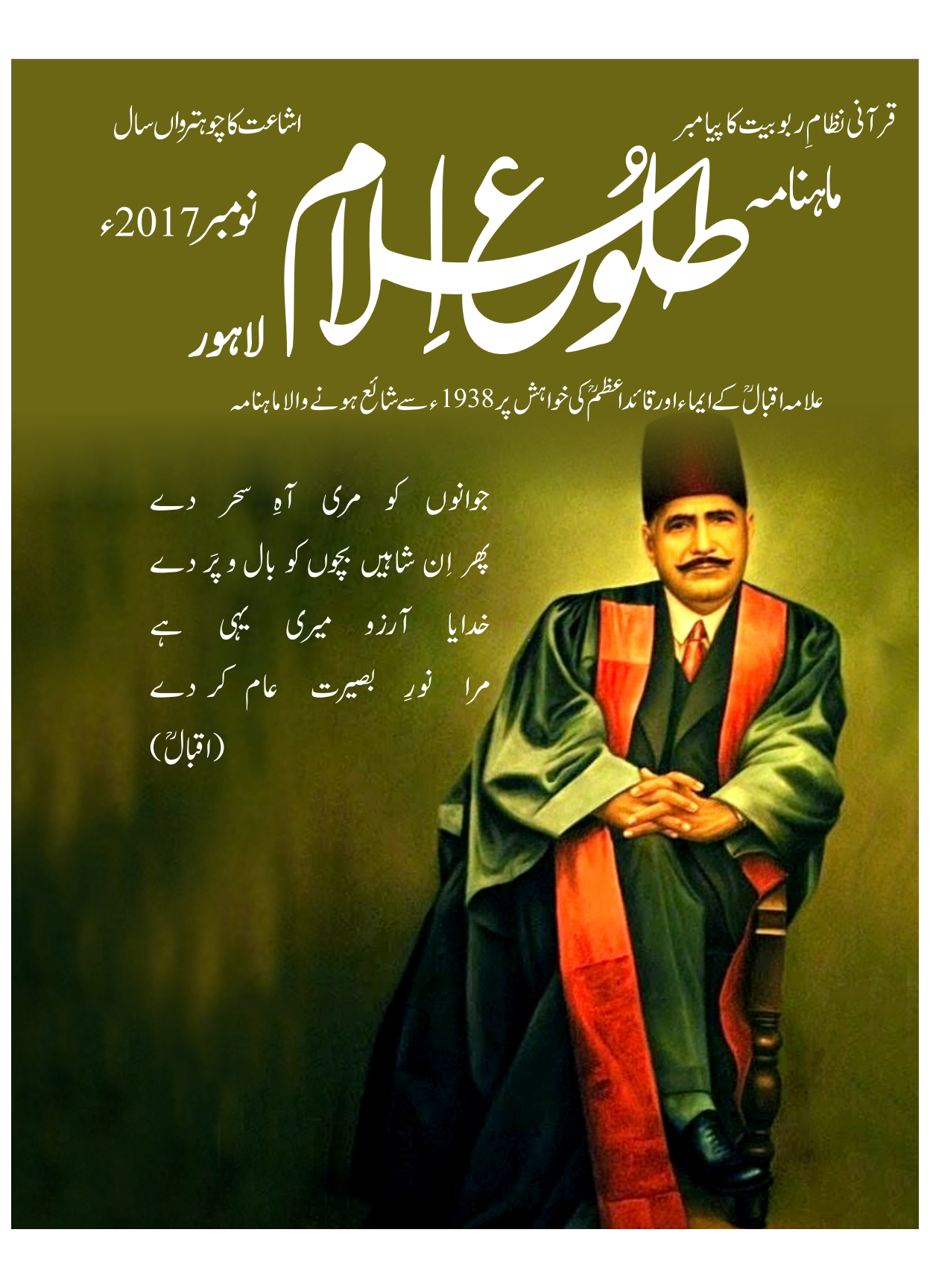
ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

نومبر 2017ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر اِن شاہیں بچوں کو بال و پَر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے
(اقبالؒ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآن کی روشنی میں اللہ اور انسان کا تعلق

1- اللہ کی ذات کے متعلق ہم ازخود کچھ نہیں جان سکتے انسان زمان و مکان میں مقید محدود علم کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ لامحدود کے علم رکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ خدا نے اپنی جن صفات کو قرآن میں بیان کیا ہے' ان سے ہم اس کے متعلق اتنا ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔

2- خدا تمام کائنات کا خالق اور اس پر مطلق اختیار رکھتا ہے۔ خدا کی صفاتِ مطلق کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ ہر چیز کے پیمانے ان مطلق صفات کے تحت بناتا ہے۔ قرآن نے صفاتِ خداوندی کا ذکر' الاسماء الحسنیٰ کہہ کر مزید وضاحت کی ہے۔ حسن صحیح صحیح تناسب (Proportion) کا نام ہے۔ اگر کسی شے کا ذرا سا تناسب بھی بگڑ جائے تو اس کا حسن باقی نہیں رہتا۔ الاسماء الحسنیٰ خدا کی ذات کے مختلف پہلو (Facets) ہیں خدا کی ذات موجود فی الخارج ہے اور چونکہ مکمل ترین اور بلند ترین ذات ہے اس لئے اس کے خصائص و صفات بھی مکمل ترین اور بلند ترین ہیں۔

3- قرآن کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہونے کی وجہ سے صفات و اقدار خداوندی کے علم کا حصول اسی قرآنِ کریم کے ذریعے ہی ممکن ہے' جسے قیامت تک کے لئے نوع انسانی کی ہدایت کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ اللہ کی ہدایت جاننے کے لئے کوئی صورت نہیں۔ لہٰذا اس کی اطاعت کا بھی یہی مفہوم ہے کہ قرآن کریم میں دیئے گئے اقدار و احکام کی اطاعت کی جائے اس کو پکارنے کے معنی بھی یہی ہیں کہ زندگی کے ہر دوراہے پر' اس کی دی ہوئی راہنمائی سے دریافت کیا جائے کہ ہم کس راستہ کو اختیار کریں۔

4- خدا کی ذات میں اس کی صفات مکمل ترین شکل میں جلوہ بار ہوتی ہیں۔ بجز ان صفات کے جن کا تعلق خالصتاً خدا کی لامتناہیت اور لامحدودیت سے ہے' انسانی ذات کی بنیادی صفات خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں' اس فرق کے ساتھ کہ:

(الف) انسانی ذات کی یہ صفات محدود' سمٹی ہوئی شکل میں ہوتی ہیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 68 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

نومبر 2017ء

جلد 70 | شمارہ نمبر 11

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: اقبال، اسلام اور تصورِ پاکستان	ادارہ	4
قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟	پرویز	6
پرویز صاحب اور ان کے نظریات کا تعارف	ملک منظور حسین لیل	18
برما کے مسلمانوں کی مدد کرنا	خواجہ ازہر عباس	26
نوعِ انسانی امتِ واحدہ۔۔۔ایک قرآنی تصور	ڈاکٹر راحیل اکبر	34
بچوں کا صفحہ: تم بہت بہادر ہو	ادارہ	42
نوجوانوں کا صفحہ: نخلِ سینا	محمد علی صابر صدیقی	44
دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان	ڈاکٹر انعام الحق	48

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

The Sunrise of Humanity
(*Tulu-e Aftaab* طلوع آفتاب)
(Translated by: M. Alam) 58

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546 , Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com
www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

اقبال، اسلام اور تصورِ پاکستان

1930ء میں علامہ اقبالؒ کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (منعقدہ الٰہ آباد) کی مسندِ صدارت سے ملّت کو مخاطب کرنے کا موقع ملا۔ ان کا یہ خطبۂ صدارت ہماری تاریخ میں ایک شہ نشان کی حیثیت رکھتا ہے۔ صدیوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ گنگ وجمن کے سنگھم پر کھڑے ہو کر ایک حکیم انقلاب نے قوم کو اس کی گم گشتہ منزل مقصود کا سراغ دیا۔ یوں سمجھئے کہ یہ خطاب ایک اذانِ سحر تھی جو فضاؤں میں گونجی اور اسے سُن کر خوابیدہ قوم انگڑائیاں سی لینے لگی۔ اقبالؒ نے کہا تھا:

میری آرزو ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری زیر سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر۔ کچھ بھی ہو مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

(خطبۂ صدارت الٰہ آباد، بحوالہ طلوع اسلام، مارچ 1939ء)

اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدّنی قوّت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اُسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔۔۔ اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو اس سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیاء کی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ (ایضاً)

انہوں نے مسلمانوں کی قومی اُمنگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے اس کی مزید وضاحت کی اور کہا:

یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنی نشوونما کا موقعہ ملے۔ اس لئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدتِ قومی کے نظامِ حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو اربابِ سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں اور جس سے ان کا مقصد وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انہیں غلبہ اور تسلط حاصل ہو۔ (ایضاً)

اقبالؒ نے اس تاریخی خطبہ میں جو اٹل حقائق پیش کئے وہ ملت کے لئے تنظیم وعمل کا پیغام بھی تھے اور دعوتِ انقلاب بھی، کاروانِ ملت کے لئے اس میں منزل کی نشان دہی بھی تھی اور بانگِ رحیل بھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی انوارِ قرآنی سے فیضیاب نگہ بصیرت پورے یقین واعتماد سے دیکھ رہی تھی کہ جو کچھ وہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا وہ مستقبل کے اُفق پر محسوس

ومشہود اور زندہ جاوید تاریخی حقائق کی صورت میں جلوہ بار ہو کر رہے گا۔

اسلام، ثبات وتغیر کا حسین امتزاج:

اقبالؒ نے ہمیں نہ صرف پاکستان کا تصور عطا کیا بلکہ اس حقیقت کی بھی وضاحت کر دی کہ جس اسلامی دستورِ حیات کو اس جداگانہ مملکت کی رُوح بننا ہے اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں۔ یہی خصوصیات ہیں جنہیں نگاہوں سے اوجھل کر کے ہم حصولِ پاکستان کے بعد پے در پے ناکامیوں، مایوسیوں اور گوناگوں الجھنوں کی گردشِ دولابی کا شکار ہو رہے ہیں۔ سنیے کہ انہوں نے اپنے خطبات ــــ تشکیلِ الٰہیاتِ جدید ــــ میں اس حقیقت کو کس قدر نکھار کر منظرِ عام پر پیش کیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر وتنوع کے پیکروں میں ہوتی ہیں۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلق کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق اور توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم وضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ دنیا میں، جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ــــ تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی وسیاسی دوائر میں جو ناکامی ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

یہ تھا اقبالؒ، وہ دانائے راز اور حکیمِ انقلاب، جس نے سرسیدؒ کی پھیلائی ہوئی روشنی میں کاروانِ ملت کے ذوقِ سفر کا رُخ اس کی حقیقی منزلِ مقصود کی طرف پھیر دیا۔ جہاں سرسیدؒ نے صدیوں کے بعد پہلی دفعہ قوم کے فکر وبصیرت سے اپیل کی اور جذبات کے دھاروں پر بہنے کی بجائے زندگی کی عملی حقیقتوں سے عہدہ برآ ہونا سکھایا۔ وہاں اقبالؒ نے بھی اپنی حیات آفریں دعوت، علم وبصیرت کی روشنی میں پیش کی۔ یہی خوش گوار اور خوش آئند انقلاب تھا جو مدتوں کے بعد ہماری قومی زندگی میں بپا ہوا۔ یعنی قوم پہلی بار جذبات کی ہنگامہ خیزیوں اور پُرفریب نعرہ بازیوں سے دامن کشاں ہو کر سنجیدگی سے اپنے مقام اور منزل کو سمجھنے پر مائل ہوئی۔ اگر تاریخی نشیب وفراز کا حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ دینی انقلاب، معمولی کام نہ تھا بلکہ بہت بڑی معجزنمائی تھی جو خدائے ذوالمنن کی عنایاتِ بے غایات کے صدقے میں ہمیں نصیب ہوئی۔

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟

اسلام ایک زندہ نظام حیات بننے کے لئے اپنی آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ یہ وہ شرط ہے جس کے پورا نہ ہونے سے وہ دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب بن کر رہ جاتا ہے' دین یعنی نظام حیات نہیں بن سکتا۔ (مثلاً) اس نظام کے بنیادی ستون اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہیں' اور اس کا اصل الاصول' امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ ہمارے مروجہ تصور اسلام کی رو سے' اقامت صلوٰۃ کے معنی ہیں صرف نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم' غریبوں اور گداگروں کو کچھ پیسے بطور خیرات دے دینا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے مقصود ہے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بات کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ فرائض ہم' انگریز کے عہدِ غلامی میں بھی آزادانہ ادا کر سکتے تھے اور آج' بھارت کا مسلمان' بایں ہمہ بے بسی و بے کسی' انہیں اپنے طور پر ادا کر سکتا ہے لیکن قرآن کریم ان کی ادائیگی کے لئے' اپنی حکومت کا قیام' لازمی شرط قرار دیتا ہے۔ جہاں کہتا ہے کہ۔۔ (مفہوم) یہ وہ لوگ ہیں' (یعنی جماعت مومنین) کہ جب انہیں حکومت ملے گی تو یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا انصرام کریں گے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا فریضۂ حیات ہوگا۔ (22:41)۔ یا (مثلاً) مذہبی سطح پر اسلام سے مقصود یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کرے اور شرک سے مجتنب رہے یعنی غیر اللہ کی پرستش نہ کرے۔ اس مقصد کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر مقام پر' ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں ہے کہ دین کے تمکن کیلئے استخلاف فی الارض ضروری ہے' کیونکہ اس کے بغیر نہ خدا کی عبودیت اختیار کی جا سکتی ہے اور نہ شرک سے اجتناب ممکن ہے۔ سورہ نور میں ہے کہ خدا نے تم سے حکومت کا وعدہ کر رکھا ہے تا کہ تم اس کی عبودیت اختیار کر سکو اور شرک سے بچ سکو یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ط (24:55)۔۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو قبیلہ بنی عامر کا ایک بہت بڑا سردار آپ ﷺ کے پاس آیا اور اس دعوت کے مقاصد کے متعلق وضاحت چاہی۔ آپ ﷺ کی وضاحت پر اس نے پوچھا کہ اگر میں ان امور پر کاربند ہو گیا تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنت' یعنی باغ و بہار آخرت۔ ہمیشہ رہنے والی زندگی۔۔ اس نے کہا کہ یہ بعد کی بات ہے۔ میں یہاں کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ۔۔ نعم النصر و التمکین فی البلاد۔۔ اس دنیا میں فتوحات اور حکومت حاصل ہوگی۔ (الکامل)۔

اسلام کا تقاضا:

یہ تھا اسلام کے دین (یعنی زندہ نظام حیات) بننے کا تقاضا' جس کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''اس سے اسلام' اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصر حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔'' (خطبہ الٰہ آباد، 1930ء)۔

اس سے بھی پہلے' انہوں نے اپنے خطبات میں اس حقیقت کی وضاحت کر رکھی تھی کہ:

''اسلامی نقطۂ نگاہ سے' مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان و مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئت اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔''

اس مملکت میں' عبادت نام ہوتا ہے قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے کا اور شرک سے مفہوم ہوتا ہے انسانوں کے خودساختہ احکام وقوانین کی اطاعت۔ اقامت صلوٰۃ سے مقصود ہوتا ہے ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افراد معاشرہ' ان قوانین کا از خود' بہ طیب خاطر' اتباع کرتے جائیں اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم ہوتا ہے تمام افراد معاشرہ (بلکہ عالمگیر انسانیت) کو سامان نشوونما مہیا کرنا۔ اس میں امر بالمعروف کے معنی ہوتے ہیں ان احکام وضوابط کا نافذ کرنا جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے قانوناً روکنا جنہیں وہ مذموم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ:

''اسلام' تخت وتاج سے وفاشعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ صرف خدا (کے قوانین) سے عہد وفا استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔'' (خطبات)

اور قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ:

''اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام واصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست ومعاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت' دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول واحکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' (حیدرآباد دکن' 1941ء)

یہ ہے ایک اسلامی مملکت کی تخلیق وتشکیل کی وجۂ جواز اور یہ تھی وہ بنیاد جس پر مطالبۂ پاکستان کی عمارت استوار کی گئی تھی اور جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

لوحِ سادہ:

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب اسلام کی انقلابی دعوت پیش کی تو اس میں مخالفین کے ساتھ

سب سے بڑی وجۂ نزاع اور سب سے شدید سبب تصادم کیا تھا؟ انہیں زندگی کے اس نظامِ نو کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور وہ اس کے جواب میں کہتے تھے۔ کہ: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ مُّھْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ (43:22) ہم اس نئے نظام کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اسی مسلک پر چلتے رہنا چاہتے ہیں جو ہمارے اسلاف سے ہم میں متوارث چلا آ رہا ہے۔ ہم انہی کے نقوش قدم کا اتباع کریں گے۔ ہم اپنی روایات کہنہ کو نہیں چھوڑنا چاہتے'۔ ان سے' اس کے جواب میں کہا جاتا کہ: اَوَلَوْ جِئْتُکُمْ بِاَھْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَیْہِ اٰبَآءَکُمْ ط (43:24)۔ جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے اگر یہ اس سے بہتر ہو جس پر تم اپنے آباؤ واجداد کی تقلید میں چلے جا رہے ہو' تو کیا تم پھر بھی اپنے اسلاف کے مسلک ہی کو ترجیح دو گے؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں! ہم اسی مسلک کا اتباع کریں گے۔ ہمیں کسی نظامِ نو کی ضرورت نہیں حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا ط (5:104) وہ مسلک ہمارے لئے ہر اعتبار سے کافی ہے'۔۔ یہ تھی وہ بنیادی کشمکش جو اس قدر شدید تصادمات کا موجب بنی۔ جب ان مخالفین نے دیکھا کہ یہ نظام زور پکڑتا جا رہا ہے تو انہوں نے چاہا کہ اس سے کچھ مفاہمت کی صورت نکل آئے۔ یعنی کچھ باتیں اس نظامِ جدید کی لے لی جائیں اور کچھ ان کے مسلک آباء کی' اور دونوں کے امتزاج سے ایک نظام وضع کر لیا جائے۔ لیکن دین کے نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا شرک ہوتا اس لئے رسولؐ اللہ سے بتاکید کہہ دیا گیا کہ: وَلَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا (11:113) دیکھنا! ان لوگوں کی طرف ذرا سا بھی جھک نہ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا' تو فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ ۙ تمہاری جماعت بھی اسی عذاب میں گرفتار ہو جائے گی جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں اور جس سے نکالنے کے لئے انہیں اس نظام کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔

لہٰذا' ایک قرآنی مملکت کی تشکیل کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ان تمام نظریات حیات و تصورات زندگی' ان تمام روایات کہنہ اور مسالک قدیمہ کو الگ کر کے رکھ دیا جائے جو اس قوم میں متوارث چلے آ رہے ہیں۔ اس مملکت کا بنیادی پتھر۔۔ لا الٰہ الا اللہ۔۔ ہے۔ اس میں لا الٰہ کے معنی یہ ہیں کہ تمام متوارث تصورات کو الگ کر کے' ہر شے کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے۔ اس کے بغیر' اس جدید نظام کی عمارت (جس کی بنیاد الا اللہ پر استوار ہوتی ہے) قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ؎

ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند اول آں بنیاد را ویراں کنند

اسلام میں ''بت پرستی'' کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے اوثان کا لفظ آیا ہے جو وثن کی جمع ہے اور وثن کے معنی ہوتے ہیں جمود و تعطل' عدم حرکت' جامد و غیر متحرک ہو جانا۔۔ اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وثن ہے۔ جب قرآنی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دے دی جائے تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکت پیہم اور سعی مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ''حرکت پیہم'' کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ' قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانہ کے بدلتے اور بڑھتے رہنے

والے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (Dynamic Movement) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے، اس میں جمود پیدا ہو جائے تو یہ وثنیت ہوگی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ حیرت ہے کہ ہم نے قرآن کے اس عظیم نقطہ کو پس پشت ڈال دیا اور مغرب کے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ چنانچہ ''وہائیٹ ہیڈ'' لکھتا ہے کہ:

''بت پرستی کی کنہ وحقیقت مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا ہے۔''

(ایڈونچر آف آئیڈیاز، ص:12)۔

اس قسم کی بت پرستی میں، ایک زندہ اور متحرک نظام حیات کے تصورات ومناسک کی محض شکلیں باقی رہ جاتی ہیں، ان کے معانی ومفہوم ختم ہو جاتے ہیں۔ مذہب، دین کی ممی شدہ لاش ہوتا ہے۔ ان بے روح رسوم اور بے جان معتقدات سے چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق وہائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ:

''زندگی کے بے جان پیکروں کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سست رفتار زوال ہوتا ہے جس میں ان رسوم کو بلا نتیجہ دہرایا جاتا ہے..... اس سے تہذیب وترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت غائب ہو جاتی ہے۔'' (ایڈونچر آف آئیڈیاز، ص:358)۔

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان، بلا سوچے سمجھے اور بلا اختیار وارادہ، اپنے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں آگے بڑھنے، اور کچھ اور بننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے بکری کا بچہ بکری ہی بن سکتا ہے اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسے ادوار آتے رہے جن میں تقلید کی ان برفانی سلوں کو توڑ کر کاروان انسانیت کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کا انسان بھی، اپنے اسلاف کی طرح، غاروں میں پڑا زندگی بسر کرتا۔ یاد رکھئے۔ جوہر زندگی کی نمود، اپنے اختیار وارادہ اور فکر وبصیرت سے، تعمیری کام سرانجام دینے سے ہوتی ہے۔ اگر وہ کام جنہیں عام طور پر نیکی کہا جاتا ہے، محض تقلیداً کئے جائیں، تو یہ انسانی زندگی میں نشوارتقاء کا موجب نہیں بن سکتے۔ انسانی زندگی میں (Moral) تو خیر بڑی چیز ہے، اس میں (Immoral) ہونا اتنا تباہ کن نہیں جتنا ہلاکت آفریں (Amoral) ہونا ہے۔ تقلید میں انسان (Amoral) ہو جاتا ہے۔

یہی وہ جمود ہے جسے توڑنے کے لئے اقبال کہتا ہے کہ: ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارے نادر آید! — گنا ہے ہم اگر باشد، ثواب است

مفہوم: اپنے ہی تیشہ سے اپنا راستہ بنائیے۔ دوسروں کے، بنے بنائے، راستے پر چلنا عذاب ہے۔ اگر آپ کے ہاتھ سے کوئی نادر اور انوکھا کام سرانجام پائے، اگر وہ کام گناہ کے زمرہ میں آتا ہو پھر بھی اپنی

ندرت اور انفرادیت کے باعث ثواب کا مستحق ہوگا۔ (س۔ا)

قرآن کریم نے' اپنا تعارف کراتے' یا یوں کہئے کہ اپنے نزول کا مقصد بتاتے ہوئے کہا ہے کہ: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ (97:1) یعنی قرآن دنیا میں نئی اقدار لایا ہے اس کی آمد سے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے تمام قدیم پیمانے الٹ گئے ہیں اور ان کی جگہ ان نئے پیمانوں نے لے لی ہے۔ قرآن کی اولین مخاطب قوم کی طرف سے جو اس کی مخالفت ہوئی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے قدیم پیمانوں کو' جو ان کے اسلاف کی طرف سے متوارث چلے آ رہے تھے' ان جدید پیمانوں سے بدلنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اقبالؔ نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس مملکت کو وجود میں لانے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ:

''اس سے اسلام کو ایسا موقعہ میسر آ جائے گا جس سے یہ اس ٹھپہ کو مٹا سکے گا جو عرب ملوکیت نے زبردستی اس پر لگا رکھا ہے۔'' (خطبہ الٰہ آباد)۔

روشِ کہن:

ہمارا مروجہ مذہب' ہماری شریعت' ہمارا کلچر' ہماری روایات' ہمارا فلسفۂ حیات' ہمارے رسوم و مناسک' غرضیکہ ہر وہ شے جسے ہم اس وقت عام طور پر اسلامی کہہ کر پکارتے ہیں' عرب ملوکیت کے دور کی پیدا کردہ ہے۔ اقبال نے اس کے لئے ''عجمی اسلام'' کی اصطلاح وضع کی تھی کیونکہ یہ پیدا تو عرب ملوکیت کے زمانہ (بالخصوص دور عباسیہ) میں ہوا تھا' لیکن تھا عجم سے مستعار لئے ہوئے تصورات کا مجموعہ۔ اسی لئے حکیم الامت نے مروجہ اسلام پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

شریعت' طریقت' تصوف' کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام

پاکستان کی تشکیل سے مقصد ان ''بتان عجم'' کو حریم کعبہ سے نکال کر' اسے خالصتہً ''خدا کے گھر'' میں تبدیل کرنا تھا۔ یعنی ہمارے ہاں ''جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے'' اس کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر معاشرہ کو از سر نو مستقل اقدار خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا۔

مذہبی پیشوائیت:

''بتان عجم'' کے یہ پجاری ہمارے مذہبی پیشوا ہیں۔ آپ کو معلوم ہے (اور قرآن اس حقیقت کو بار بار سامنے لاتا ہے) کہ قرآنی نظام کی دعوت کی شدید ترین مخالفت' اہل کتاب کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوئی تھی۔ مذہبی پیشوائیت' ماضی کی کہنہ اور فرسودہ روایات کے محافظ ہونے کے مقدس سہاروں سے قائم رہتی ہے اور ان روایات کے ختم ہو جانے سے ان کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ وہ روایات کو زندہ اس لئے رکھنا چاہتی ہے کہ ان کی زندگی سے خود ان کی اپنی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔ ورنہ انہیں ان روایات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ ؎

حکایتِ قدِ آں یارِ دلنواز کنم بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

مفہوم: اس دل نواز دوست کی طویل قد و قامت کا تذکرہ اس لئے کرتا ہوں تا کہ اس بہانے اپنی عمر کو

دراز کرتا ہوں۔(م۔س۔ا)

قرآنی نظام میں جب یہ فرسودہ روایات ہی باقی نہیں رہتیں تو اس میں مذہبی پیشوائیت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آپ کو نبی اکرمؐ اور خلافت راشدہ کے زمانہ میں مذہبی پیشوائیت کا نام تک نہیں ملتا۔اس نظام میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر حکومت کا فریضہ تھا جو قرآنی معروفات کو قانوناً نافذ کرتی' اور اس کے برعکس اقدامات کو قانوناً روکتی تھی۔

قرآنی پاکستان میں زندگی کو ایک لوح سادہ (Clean Slate) سے شروع کیا جاتا جس میں فرسودہ عجمی تصورات کی قبروں کے مجاوروں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہوتی اور ملت پاکستانیہ' حضور نبی اکرم ﷺ کے ان الفاظ گرامی کو پورے حزم ویقین اور کامل وثوق واعتماد کے ساتھ' ببانگ دہل دنیا کے سامنے دہرا سکتی جنہیں آپ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا کہ:

الا ۔کل شئی من امر جاھلیت تحت قدمی موضوع۔

ہاں! زمانۂ جاہلیت کے تمام آئین ودستور میرے پاؤں کے نیچے پامال ہیں۔

قرآنی پاکستان' اس عظیم انقلابی اعلان کی نشرگاہ ہوتا۔اسی کے لئے اقبالؒ نے کہا تھا۔کہ ؎

وقت آنست کہ سامانِ سفر تازہ کنیم لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

مفہوم: وقت آن پہنچا ہے کہ سفر کے سامان کو تازہ کریں۔اپنے دل کی تختی کو دھوڈالیں اور اس کو (نئی تحریریں لکھنے کے لیے) تازہ کریں۔(م۔س۔ا)

حاکم ومحکوم کا امتیاز:

قرآنی مملکت میں' حاکم اور محکوم کا تصور نہیں ہوتا۔ہم نے دیکھا ہے کہ اس مملکت کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔قرآن کریم نے یہ فریضہ امت کے کسی خاص گروہ کا قرار نہیں دیا' بلکہ ساری کی ساری امت کا قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:110) تم وہ بہترین امت ہو جسے ہم نے نوع انسان کی بہبود کے لئے متشکل کیا ہے۔تمہارا فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے۔اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے' تقسیم عمل کے اصول کے مطابق' مختلف کام مختلف افراد کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔گویا یہ ایک ٹیم ہوتی ہے جو باہمی تعاون سے زندگی کو اس کی منزل مقصود تک لے جاتی ہے۔اس میں' افسر اور ماتحت یا حاکم اور محکوم کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ الدِّينِ ﴿١٨﴾' یعنی قرآنی نظام کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ ﴿١٩﴾ (82:19) کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر نہ کسی قسم کا کوئی کنٹرول یا حق حکومت رکھے' نہ کوئی کسی دوسرے کا محتاج ہو۔اس میں تمام معاملات قوانین خداوندی کے مطابق طے پاتے چلے جائیں۔اس میں کسی کو اس کا حق نہیں ہوتا کہ دوسرے سے کہے کہ: كُونُوا عِبَادًا لِّي (3:79) تم میرے محکوم ہو جاؤ۔۔نہ کسی کا کوئی محکوم نہ محتاج۔اقبالؔ کے الفاظ میں ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں' این است و بس

مفہوم: دنیا میں کوئی کسی انسان کا محتاج نہیں ہوگا۔ شرعِ مبین، اسلام کا نکتہ یہی ہے اور بس۔ (م۔س۔ا)

جب عہدِ فاروقی میں روم کا سفیر مدینہ آیا اور اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کون ہے' تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا تھا کہ: مالنا ملك۔ بل لنا امیر۔۔ ہمارا بادشاہ کوئی نہیں' ہمارا صرف امیر ہے۔ واضح رہے کہ لفظ امیر کے بنیادی معنی مشورہ کرنے والے یا راہنمائی کرنے والے کے ہیں۔ امت' جس شخص کے سپرد یہ امانت کرتی ہے' اس کا فریضہ کیا ہوتا ہے' اس کے متعلق امت کے سب سے بڑے منتخب کردہ امیر' صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں' ان الفاظ میں وضاحت کر دی تھی کہ:

''یاد رکھو! تم میں سے ہر کمزور' طاقت ور ہے جب تک میں اس کا حق نہ دلاؤں اور ہر طاقتور کمزور ہے جب تک اس سے کمزور کا حق نہ لے لیا جائے۔''

اس فریضہ کو حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں دہرایا تھا۔ کہ:

''یاد رکھو! اگر کوئی شخص کسی پر زیادتی کرے گا تو میں اس وقت تک اسے نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر پاؤں نہ ٹکا دوں۔ تا آنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔ لیکن تم میں سے حقدار کے لئے میں اپنا رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔''

خلافت اور ملوکیت میں فرق:

وہ اکثر لوگوں سے دریافت کرتے رہتے کہ میں کہیں خلافت سے روگردانی کر کے' بادشاہت کی طرف تو نہیں جا رہا؟ ایک دفعہ جب انہوں نے یہی سوال دہرایا تو ایک شخص نے جواب میں کہا کہ خلافت اور بادشاہت کا فرق بڑا نمایاں ہے اس لئے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ہاں خلافت ہے یا بادشاہت۔ خلیفہ تمام افراد معاشرہ کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے اور بادشاہ ان کے حقوق میں ظلم اور جبر کرتا ہے۔ وہ ایک طرف سے لوٹتا ہے اور دوسری طرف (اپنے مقاصد کے لئے) خرچ کرتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خلیفہ ہیں' بادشاہ نہیں۔

انہوں نے اپنے پہلے خطبہ میں کہا تھا کہ:

''لوگو! میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں' میں ان کی وضاحت کرتا ہوں۔ تمہارا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ تمہارے اموال میں سے کوئی چیز نہ لوں مگر قانون خداوندی کے مطابق اور جو کچھ لوں' اس میں سے کچھ خرچ نہ کروں مگر حق کے مطابق۔''

اور یہ بھی کہا تھا کہ:

''تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ جب تم مہمات کے سلسلہ میں اپنے بچوں سے دور ہو جاؤ تو میں ان بچوں

کا باپ بنوں۔''

وہ کہا کرتے تھے کہ میری اور دیگر افراد معاشرہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پارٹی سفر کے لئے نکلے تو سب لوگ اپنے پیسے ایک شخص کے سپرد کر دیں کہ وہ سفر کے سلسلہ میں ضروری اخراجات کرتا جائے اور اس کا حساب رکھے۔۔۔ لہٰذا مسلمانوں کے مال میں میرا حصہ اتنا ہی ہے کہ کپڑوں کے دو جوڑے۔ ایک گرمی کا اور ایک سردی کا۔ اور میرے اور میرے اہل وعیال کے لئے اتنا کھانا جو قریش کے ایک عام آدمی کی خوراک ہے۔

بیوی بچے فتنہ نہ بن جائیں:

اہل وعیال کے معاملہ میں ایک طرف قرآن نے انہیں: زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ (18:46) کہا ہے۔ انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک قُرَّةَ اَعْيُنٍ (25:74) کا موجب قرار دیا ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی بتا دیا ہے کہ یاد رکھو اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ (8:28) یہ انسان کے لئے بہت بڑی آزمائش کا موجب بن جاتے ہیں اور مقاصد حیات میں تمہارے سب سے بڑے دشمن اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ (64:14) ''یاد رکھو! تمہاری اولاد اور بیویاں بعض اوقات تمہاری سب سے بڑی دشمن ہوتی ہیں۔'' تمہاری زندگی کے بڑے بڑے بلند مقاصد انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے تمہارے پاؤں میں ایسی لغزش آتی ہے کہ تم اپنے مقام بلند و رفیع سے گر کر چکنا چور ہو جاتے ہو۔ اس لئے فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ ان سے بہت محتاط رہنا۔ قرآنی مملکت میں اس لغزش کی گھائی کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی ایک بیوی تھی جسے ان کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ جب امور خلافت ان کے سپرد ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ امور مملکت میں دخیل ہوتی ہے اور بعض اوقات غلط سفارشات کر دیتی ہے۔ جب اس نے تنبیہہ کے باوجود اپنی اس عادت کو نہ بدلا تو آپ نے اسے طلاق دے دی۔ اولاد کے بارے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ عراق کے گورنر (حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) نے ان کے دو لڑکوں (جناب عبداللہ اور عبیداللہ) کو کچھ رقم خزانہ میں داخل کرنے کے لئے دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم اس رقم کو قرض سمجھ کر اس سے تجارت کر لیں اور پھر اصل رقم بیت المال میں جمع کرا دیں تو اس کی اجازت ہے؟ انہوں نے اجازت دے دی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اس مال کی تجارت سے جو منافع ہوا ہے وہ بھی بیت المال میں داخل کرنا ہوگا۔ بیٹوں نے کہا کہ گورنر نے انہیں اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس پر آپ نے پوچھا کہ کیا اس نے کسی اور کو بھی اس قسم کی اجازت دی تھی؟ یا تمہارے ہی ساتھ یہ رعایت برتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ کسی اور کو تو اس قسم کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس پر آپؓ نے کہا کہ اس نے یہ رعایت تمہیں امیر المومنین کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دی ہے اور یہیں سے فساد کی ابتدا ہوا کرتی ہے۔ قرآنی مملکت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں اپنے فیصلے کو واپس نہیں لینا چاہتا۔۔ اس باب میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب وہ امہات المومنینؓ (یعنی رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات) کو بیت المال سے کوئی چیز بطور تحفہ بھیجتے تو حضرت حفصہؓ کا حصہ آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں

کچھ کمی رہ جائے تو وہ ان کے حصہ میں ہو۔ یہ اس لئے کہ حضرت حفصہؓ، حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی تھیں۔۔قحط کے زمانے میں آپ نے گلی میں ایک بچی کو دیکھا کہ بھوک سے نڈھال ہو رہی ہے۔آپ کو اس سے بڑا صدمہ ہوا۔کہا کہ کوئی پہچانتا ہے کہ یہ بچی کون ہے؟ بیٹا ساتھ تھا۔اس نے کہا کہ یہ آپ کی پوتی (فلاں) ہے۔آپ نے کہا کہ اس کی حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے۔ اس نے کہا کہ قحط کی وجہ سے جتنا کچھ ملتا ہے اس میں یہ حالت نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا۔۔۔؟ آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور کہا کہ پھر جو حال قوم کے دوسرے بچوں کا وہی عمر کی پوتی کا ہوگا۔تنگی ہوگی تو سب پر اور کشادگی ہوگی تو سب کے لئے۔۔انکا دستور تھا کہ:

''جب مملکت میں کوئی امتناعی حکم نافذ کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔اور لوگ تمہاری طرف ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے پرندے گوشت کی طرف۔۔اگر تم محتاط رہو گے تو وہ بھی رہیں گے۔اور اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا تو (اس کی وجہ سے کہ تمہارے اعمال کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے) تمہیں ان سے دگنی سزا دوں گا۔اب تمہارا اختیار ہے۔چاہے آگے بڑھو اور چاہے پیچھے ہٹو۔'' (تاریخ عمرؓ، ابن جوزی)

عدل:

قرآنی مملکت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر ایک سے عدل ہوتا ہے۔عدل کی ایک شکل یہ ہے کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قانون کے مطابق کیا جائے۔اور اس میں کسی کی رورعایت نہ کی جائے۔یہی ہے وہ مملکت جس میں ہر صاحبِ اختیار سے یہ کہا جاتا ہے کہ: اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى (38:26) تمہیں مملکت میں صاحبِ اختیار اس لئے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں کے فیصلے حق کے ساتھ کرو اور اس میں اپنے جذبات کو کبھی دخیل نہ ہونے دو۔

یہاں کہا گیا ہے کہ لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ حق کے ساتھ کرو۔یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔عدل کا عام تصور یہی ہے کہ اگر معاملات کا تصفیہ ملک کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو کہا جائے گا کہ عدل کا تقاضا پورا ہو گیا۔لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود وہ قانون، جس کے مطابق فیصلہ ہوا ہے، عدل پر مبنی نہیں ہوگا تو اس کے مطابق فیصلہ کو مبنی بر عدل کیسے کہا جائے گا؟ اگر قانون کے استعمال میں جذبات اثر انداز ہو سکتے ہیں تو قانون سازی میں جذبات کیوں اثر انداز نہیں ہو سکتے! یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں قانون سازی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔اس میں تمام قوانین، اصولی طور پر، خدا کے متعین فرمودہ (قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ) ہوتے ہیں اور مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ العمل بنائے۔قرآن کریم کا تعارف، سب سے پہلی آیت میں، الکتاب کہہ کر کرایا گیا ہے۔الکتاب ضابطۂ قوانین کو کہا جاتا ہے۔قرآن کریم میں چند ایک قوانین تفصیلی طور پر دیئے گئے ہیں اور باقی تمام قوانین اصولی طور پر درج ہیں۔ان

اصولی قوانین کی جزئیات' ہر زمانے کی امت' اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق' باہمی مشاورت سے مرتب کرے گی۔ ان جزئیات' (یا بائی لاز) میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تغیر وتبدل ہوتا رہے گا۔ لیکن اصولی قوانین ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔ ان میں تبدیلی کا حق کسی ایک فرد' یا پارلیمان تو ایک طرف' ساری دنیا کی آبادی کو بھی حاصل نہیں ہوگا۔ جو مملکت' قرآنی قوانین کے مطابق فیصلے کرے گی اسے اسلامی مملکت کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (5:44)

جو خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا' قرآنی مملکت میں ہر فیصلہ قرآنی قوانین کے مطابق ہوتا ہے اور ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں' نہ فیصلہ کرنے والے کے ذاتی رجحانات ومیلانات اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے خارجی موثرات دخیلِ کار اس دور میں کوئی شخص (قانون کے مقابلہ میں) کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آسکے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش مجرم کو بچا سکے گی' نہ ہی اس سے کچھ لے لوا کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی کوئی کسی اور طرح مجرم کی مدد کر سکے گا۔ (2:48)

اس میں مجرم چھپا نہیں رہ سکتا' دور سے پہچانا جا سکتا ہے۔۔ ''اس میں مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے۔'' (55:41) اس میں انتظام ایسا ہوتا ہے کہ مجرم' شریف انسانوں سے بالکل الگ نظر آئیں۔ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ (36:59) تاکہ کوئی ایسے لوگوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔ اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مجرم' مواخذہ سے بچ جائے یا کوئی بے گناہ یونہی دھر لیا جائے۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ (6:164) اس میں ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پاتا ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ (6:164) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

قرآنی مملکت میں' بڑی سے بڑی شخصیت بھی قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوتی۔ اس باب میں' اور تو اور' خود حضور رسالتمآب ﷺ کی زبان اقدس سے بھی یہ اعلان ہوتا ہے کہ:

اگر میں بھی قانون خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے سخت ڈرتا ہوں۔ (6:15)

اور اس کے بعد فرما دیا کہ اگر میری چہیتی بیٹی۔۔ فاطمہؓ۔۔ بھی قانون شکنی کرے تو میں اسے بھی سخت سزا دوں گا۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ مصر کے گورنر نے' ان کے بیٹے کو وہ سزا جو پبلک کے سامنے دینی چاہئے تھی' پرائیویٹ مکان میں دی ہے' تو آپ نے بیٹے کو مدینہ بلوا کر' اسے ازسرِ نو پبلک میں سزا دی۔۔ جب اسی مصر کے گورنر کے بیٹے نے ایک مصری کو کسی بات پر یہ کہہ کر ہنٹر سے پیٹا کہ تم بڑے آدمیوں کی اولاد سے گستاخی سے پیش آتے ہو' تو آپ نے' گورنر' اس کے بیٹے' اور اس مصری کو مدینہ بلوا بھیجا۔ مصری کے ہاتھ میں ہنٹر دیا اور کہا کہ اسے اسی طرح مارو اور کہو کہ تم نے دیکھ لیا کہ بڑوں کی اولاد کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اس گورنر کو بھی تادیب کی کہ اگر تم نے بیٹے کی تربیت صحیح کی ہوتی تو اس کے سر میں یہ خناس کیوں سماتا' کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے اس لئے اسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق حاصل ہے۔ خود حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ ایک

عدالت میں پیش ہونے کا اتفاق ہوا تو جج نے انہیں امتیازی مقام پر بیٹھنے کی پیشکش کی' آپ نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا اور مدعی کے برابر بیٹھ گئے مقدمہ ختم ہونے کے بعد' آپ نے جج کو لکھا کہ تم جج بننے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک تم امیر المومنین اور ایک عام شہری کو یکساں نہ سمجھو۔

قرآنی مملکت میں یہ کیفیت تو عدالت کی ہوتی ہے۔ لیکن اس میں مناسب تعلیم و تربیت سے خود افراد معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر ان سے کبھی کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو وہ خود اپنے آپ کو اپنے جرم کی سزا کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ ارتکاب جرم کا کوئی اور شاہد ہو یا نہ ہو' خود خدا کا قانون مکافات عمل سب سے بڑا گواہ ہوتا ہے۔ وہ گواہ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

وہ نگاہ کی خیانت اور دل کے اندر گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔ (40:19)

یہی تھی وہ تعلیم جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک رات حضرت عمرؓ 'حسبِ دستور' افراد معاشرہ کے حالات کا براہ راست مطالعہ کرنے کے لئے گشت کر رہے تھے کہ آپ نے سنا کہ ایک خیمہ کے اندر' ماں اپنی بیٹی سے کہہ رہی ہے کہ دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر اسے چولہے پر چڑھا دو۔ بیٹی نے کہا کہ امی! میں دودھ میں پانی نہیں ڈالوں گی' کیوں کہ خلیفہ نے اس سے منع کیا ہے۔ ماں نے جواب دیا کہ پانی ڈال دو' خلیفہ اس وقت کہاں دیکھ رہا ہے۔ لڑکی نے کہا کہ خلیفہ تو نہیں دیکھ رہا لیکن وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم خلیفہ نے ہم تک پہنچایا تھا۔

خلیفہ نے گھر آ کر بیوی سے کہا کہ صبح اس خیمہ میں جاؤ اور اس لڑکی کی ماں سے لڑکی کا رشتہ مانگ لو۔ ایسی بچی جس گھر میں آ جائے گی وہ گھر نور سے بھر جائے گا۔

پہل کہاں سے ہو؟:

لیکن افراد معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب پہلے برسر اقتدار طبقہ خود اپنے کیریکٹر میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرے۔ لوگ قانون کی اطاعت کرتے ہی اس وقت ہیں جب ان کے ارباب حل وعقد خود قانون کی اطاعت کریں۔ اسی طبقہ کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے ساری قوم سنور جاتی ہے۔ جب حضرت صالحؑ کو قوم ثمود کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے دیکھا کہ قوم تمام کی تمام بگڑی ہوئی ہے' اس کی اصلاح کی صورت کیا ہو گی؟ تو خدا کی طرف سے جواب ملا کہ گھبرانے کی بات کوئی نہیں۔ وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿٤٨﴾ (27:48) مملکت کے مرکز میں قوم کے نوسرغنے ہیں اور وہی سارے فساد کا موجب ہیں اور قوم کے معاملات کو سنورنے نہیں دیتے۔ اگر وہ راہ راست پر آ جائیں تو ساری قوم سنور جائے گی۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

''عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے لیڈر سیدھے رہتے ہیں۔ جب تک

راعی اللہ کی راہ میں چلتا ہے' رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ جہاں اس نے پاؤں پھیلائے' رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں' امیر کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔ قرآن کریم نے اس باب میں واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا جو ہمارے قوانین کو فراموش کر دے وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ اور اپنے مفاد اور جذبات کے پیچھے لگ جائے۔ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ (18:28)۔ اور یوں اس کے معاملات قاعدے اور قانون کی حدود سے تجاوز کر جائیں' تو اس کی اطاعت مت کرو۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:

اگر ایک ناک کٹا' سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر ہو' تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے' تم اس کے حکم کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (مسلم)

اسی اصول کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے پہلے خطبہ خلافت میں' ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ:

تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔

اور حضرت عمرؓ نے اسے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ:

یاد رکھو! کوئی صاحبِ اختیار دنیا میں اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اگر خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اطاعت کی جائے۔

یہ اس لئے کہ قرآنی مملکت میں اطاعت صرف قوانین خداوندی کی ہوتی ہے' کسی انسان کی نہیں۔ ان کا امیر ان قوانین کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر وہ خود ہی ان قوانین کی اطاعت نہ کرے' تو دوسرے اس کی اطاعت کس طرح کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے داعی اول۔۔ حضورؐ نبی اکرم نے خود فرما دیا کہ انا اول المسلمین۔ سب سے پہلے میں خود اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

اس مقام پر اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ امیر کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے' تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر ایک کو اس کا اختیار دے دیا جائے کہ جس وقت وہ سمجھے کہ امیر نے خدا کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کی' وہ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ اس سے تو انارکی پھیل جاتی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ قرآنی مملکت کے آئین میں اس قسم کا ضابطہ ہوگا جس کی رو سے خود امیر مملکت کے اقدامات پر نگاہ رکھی جائے گی اور جونہی وہ حد سے تجاوز کرے' آئینی اور قانونی طور پر اس کا مواخذہ ہو سکے گا اور اگر وہ مجرم ثابت ہوگا تو اس کی جگہ دوسرا امیر مقرر کر دیا جائے گا۔

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحبؒ اور اُن کے نظریات کا تعارف

(کچھ وضاحتیں)

اسلام کی تعریف:

طلوعِ اسلام مارچ 1985ء، ص:3، ''انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ انسان کو قوتِ گویائی عطا کی گئی ہے۔ وہ اپنے مقصد کا اظہار الفاظ میں کرسکتا ہے۔: وعلمہ البیان۔ خود خدا کا ارشاد ہے۔ انسان کی تمدنی زندگی کا دارومدار اسی خصوصیت پر ہے۔ لیکن یہ خصوصیت اسی صورت میں نعمت ہے کہ ہم جو لفظ بولیں۔۔ سننے والوں کے ذہن میں اس کا مفہوم متعین ہو۔ اگر ایسا نہ ہو، اور مختلف افراد ایک ہی لفظ کے معانی مختلف لیں، تو اس سے زندگی اجیرن ہو جائے۔ مثلاً آپ اس ماجرا پر غور فرمائیں کہ آپ نیم بے ہوشی کے عالم میں، شدتِ پیاس سے کہیں۔۔ پانی۔۔۔ اور آپ کے گھر والوں میں سے کوئی ماچس کی ڈبیہ لئے چلا آرہا ہو اور کوئی چمچہ۔۔ ایک آپ کے سرہانے تولیہ لئے کھڑا ہو اور دوسرا بالٹی۔ کسی کے ہاتھ میں تیل کی شیشی ہو اور کوئی آپ کا جوتا تلاش کر رہا ہو۔۔ سوچئے کہ اگر صورت یہ ہو تو خدا کی یہ نعمت (قوتِ گویائی) کس قدر عذاب بن جائے!۔ یہ نعمت اسی صورت میں قرار پائے گی، جب آپ ''پانی'' کہیں تو ہر سننے والا اس سے ''پانی'' مراد لے۔۔۔ یہ مثال تو زندگی کے عام معمولات سے متعلق ہے۔ اسے ذرا آگے بڑھایئے اور سوچئے کہ آپ اہم مسائلِ حیات کے متعلق جو الفاظ یا اصطلاحات استعمال کریں، اگر سننے والوں کے نزدیک ان کا متعین مفہوم نہ ہو، تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟۔ اسے سمجھنے کے لئے آپ خود اپنی تاریخ پر ایک نظر ڈالیئے۔ نبی اکرم ﷺ نے دنیا کے سامنے ایک نظامِ حیات پیش کیا جسے ''اسلام'' کی اصطلاح سے تعبیر کیا۔ اس کا مفہوم اس قدر واضح اور متعین تھا کہ موافق، مخالف، ہر ایک سمجھتا تھا کہ اس سے مراد کیا ہے۔ لیکن اس سے ذرا آگے چل کر ہمارے سامنے یہ نقشہ آتا ہے کہ ہر شخص کی زبان پر ''اسلام'' ہے لیکن ہر شخص کے نزدیک اس کا مفہوم جداگانہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ کہ وہی قوم جو اس اصطلاح کے متعین مفہوم سے امتِ واحدہ تھی، فرقوں میں بٹ گئی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی۔۔ تاریخ میں مسلمانوں کے سینکڑوں فرقوں کا تذکرہ آپ کے سامنے آئے گا۔۔ لیکن اس میں کوئی ایک فرقہ بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے یہ کہا ہو کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر کسی اور دین کی دعوت دے رہا ہے۔۔ ہر ایک، اسلام کی طرف دعوت دینے کا مدعی تھا اور ہر فرقہ دوسرے کے دعویٰ کی تکذیب کرتا تھا۔ ماضی کو چھوڑیئے اور حال کی طرف آیئے!۔ آج بھی مسلمانوں میں متعدد

فرقے ہیں اوران سب کا دعویٰ یہی ہے کہ وہ اسلام پر قائم ہیں اوراسی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔اس کے باوجود ہر فرقہ اپنے آپ کو اسلام کا علمبردار قرار دیتا ہے۔اور دوسروں کے اسلام کو کفر بتاتا۔۔اوران میں سے کوئی شخص اس کا فیصلہ نہیں کرسکتا کہ کس کا دعوائے اسلام سچا ہے اور کس کا جھوٹا۔اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس اصطلاح کا کوئی متعین مفہوم سامنے نہیں۔۔۔ان اصطلاحات کے مفہوم کے عدم تعین کا مظاہرہ ہم ''منیر کمیٹی'' کی روئیداد میں دیکھ سکتے ہیں۔انہوں نے پاکستان کے علمائے کرام سے کہا کہ وہ بتائیں کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔یعنی اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے؟۔ان میں سے اکثر وبیشتر تو اس سوال کا سرے سے کوئی جواب ہی نہ دے سکے۔۔۔۔۔۔۔اور جنہوں نے جواب دیا ان میں سے کسی کا جواب دوسرے کے جواب سے ملتا نہیں تھا۔ان بنیادی اصطلاحات کے مفہوم کے عدم تعین کا نتیجہ ہے کہ قوم اس قدر تشتت و انتشار، اور فساد وخلفشار کا شکار ہورہی ہے۔ہر ایک کی زبان پر لفظ ''اسلام'' کا ہے لیکن ہر ایک کا راستہ جدا جدا اور منزل الگ الگ ہے۔قرآن کریم نے تفرقہ کو جو شرک قرار دیا ہے (30:32) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمانوں کے مختلف گروہ خدا کے ساتھ بتوں کو پوجنے لگ گئے ہیں۔توحید کے معنی ہیں ساری قوم کے سامنے ایک نصب العین حیات ہو (جو خدا کا متعین کردہ ہو) اور شرک سے مراد ہے ہر گروہ کا الگ الگ نصب العین۔یعنی اسلام کا اپنا اپنا مفہوم۔''

لفظ اسلام کی جگہ لفظ قرآن کا استعمال:

تھوڑا سا آگے چل کر لکھا ہے۔''ایک نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔اور وہ یہ کہ ہم ان مقامات میں ''اسلام'' کی جگہ ''قرآن'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔۔۔جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے، لفظ ''اسلام'' کا مروجہ مفہوم، متعین نہیں رہا، اس لئے جب اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے تو کسی کے سامنے نہ کوئی متعین مفہوم آتا ہے، اور نہ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معانی متعین کرنے کے لئے کس طرف رجوع کیا جائے۔اس کے برعکس، جب لفظ 'قرآن' استعمال کیا جائے تو اس سے ہر ایک کی نگاہ ایک خاص کتاب کی طرف اٹھتی ہے جس کے متعلق ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ وہ خدا کی عطا کردہ ہے اور ہمارے لئے ابدی راہنمائی کا ذریعہ۔۔لہٰذا، اس ذہنی خلفشار اور نظری انتشار کے عالم میں ''قرآن'' کے لفظ سے، کم ازکم توجہات ایک مرکز پر تو مرکوز ہو جاتی ہیں۔یہ وجہ کہ ہم اسلام کی بجائے قرآن کا لفظ استعمال کیا کرتے ہیں۔ورنہ اگر صدرِ اوّل کی طرح اسلام کا متعین مفہوم ہمارے سامنے ہوتا تو اسلام اور قرآن کے الفاظ کا عملاً مفہوم ایک ہی ہوتا۔''اسلام'' اس نہجِ زندگی کا نام ہے جو قرآن کے مطابق بسر کی جائے۔یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

آیاتِ قرآنی کا اطلاق:

قرآن کریم پورے عالمِ انسانیت کا ابدی ہادی اور کامل راہنما ہے۔۔اس کی ہر آیت کا اطلاق، حالات کے مطابق، ہر فرد اور ہر قوم پر ہوتا ہے۔مسلمانوں کا (یا کسی کا) یہ سمجھنا کہ فلاں آیت فلاں حالات میں نازل ہوئی تھی، لہٰذا، اس کا

اطلاق صرف فلاں فرد یا قوم (کفار، مشرکین یا اہلِ کتاب وغیرہ) پر ہوتا ہے، مسلمانوں پر نہیں ہوتا (یعنی، آیاتِ قرآنی کو صرف ''شانِ نزول'' کا پابند کر دینا)، درست نہیں۔ اسلام ہر دور کا دین ہے، اور اسی دنیا کے ہر دور میں اپنے احکامات پر عمل کرانے کے لئے نازل ہوا ہے۔ قرآن کی ہر آیت کا اطلاق، مسلمانوں سمیت، ہر فرد اور ہر قوم پر ہوگا جس کے نتائج اس دنیا میں بھی اور اگلی دنیا میں بھی ظاہر ہوں گے۔ اس بارے میں مزید وضاحت پرویز صاحب کے نظریہء قرآن (شانِ نزول) کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا مودودی (مرحوم):

مولانا مودودی کی تحریروں پر اکثر مقامات پر تنقید کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں مولانا مودودی کو مفکرِ اسلام کہا جاتا ہے اور ان کی جماعت انہیں اللہ کا شاہکار قرار دیتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نظریہء ضرورت کے قائل (بلکہ مسلمانوں میں اس نظریہ کے بانی) ہونے کی وجہ سے، ان کی تحریروں میں متعدد تضادات پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے اسلام پر حرف آتا ہے۔ مثلاً وہ مسلمانوں کے اندر کسی الگ جماعت بنانے کو غلط سمجھتے تھے مگر پھر اپنی جماعت بنالی۔ وہ قیامِ پاکستان کی تحریک کی مخالفت کرتے رہے، اور قائدِ اعظم کے خلاف لکھتے رہے مگر پاکستان بننے کے بعد اپنی سابقہ تحریروں سے رجوع کئے بغیر، اپنی باتیں بدل ڈالیں۔۔۔ خصوصاً 1941ء میں ایک الگ جماعت بنانے اور پھر اُن کے پاکستان میں آنے سے پہلے اور بعد کی تحریروں میں باہمی تضادات پائے جاتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان کے یہ تضادات سامنے لائے جائیں۔۔۔ مثلاً نظریہء ضرورت (کہ ضرورت کے تحت جھوٹ بولنا، استمناء بالید، متعہ وغیرہ جائز ہے) کے بارے میں تفہیمات۔ حصہ سوم، ایڈیشن اگست 1989ء، صفحات نمبر: 78-79، رسائل و مسائل، حصہ دوم ایڈیشن مارچ 1990ء، صفحہ نمبر: 202 اور متعہ کے جواز کے بارے میں مفصلاً ترجمان القرآن ماہ اگست 1955ء جبکہ مختصراً تفہیم القرآن تفسیر سورہ المومنون، آیات نمبر: 5-6، وضاحت نمبر: 7 (4) ملاحظہ فرمائے جاسکتے ہیں۔۔ جماعت بندی کی مذمت کے لئے ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' کے پاکستانی ایڈیشن ''تحریک آزادیء ہند اور مسلمان''، حصہ اول، ایڈیشن دسمبر 1984ء، ص: 106 اور پھر ہندوستان کی تمام مسلمان جماعتوں کو جنس کا سد (ایضاً، حصہ دوم، سوم، ایڈیشن جنوری 1985ء، ص: 104) قرار دینے کے بعد ایک صالح جماعت کے قیام کی ضرورت پر زور، اور نتیجتاً جماعت اسلامی کے قیام (ایضاً، ص: 208) اور قیامِ پاکستان کی راہ کا کوئی متعین مفہوم سامنے نہیں۔۔۔ ان اصطلاحات کے مفہوم کے عدمِ تعین کا مظاہرہ ہم ''منیر کمیٹی'' کی روئیداد میں دیکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان کے علمائے کرام سے کہا کہ وہ بتائیں کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ یعنی اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے؟۔ ان میں سے اکثر و بیشتر تو اس سوال کا سرے سے کوئی جواب ہی نہ دے سکے۔۔۔۔۔۔ اور جنہوں نے جواب دیا ان میں سے کسی کا جواب دوسرے کے جواب سے ملتا نہیں تھا۔ ان بنیادی اصطلاحات کے مفہوم کے عدمِ تعین کا نتیجہ ہے کہ قوم اس قدر تشتت و انتشار، اور فساد و خلفشار کا شکار ہو رہی ہے۔ ہر ایک کی

زبان پر لفظ ''اسلام'' کا ہے لیکن ہر ایک کا راستہ جدا جدا اور منزل الگ الگ ہے۔ قرآن کریم نے تفرقہ کو جو شرک قرار دیا ہے (30:32) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمانوں کے مختلف گروہ خدا کے ساتھ بتوں کو پوجنے لگ گئے ہیں۔ توحید کے معنی ہیں ساری قوم کے سامنے ایک نصب العین حیات ہو (جو خدا کا متعین کردہ ہو) اور شرک سے مراد ہے ہر گروہ کا الگ الگ نصب العین۔ یعنی اسلام کا اپنا اپنا مفہوم۔''

پاکستان بن جانے کے بعد:

مولانا نے لکھا کہ: ''اقبال نے ایک علیحدہ مملکت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے واضح طور پر کہا تھا کہ اس سے سیاسی آزادی مقصود نہیں بلکہ اسلام کی حفاظت مقصود ہے۔ اقبال نے آپ کو نظریہ دیا اور قائدِ اعظم نے اس نظریہ کی بنیاد پر ایک وطن حاصل کیا۔'' (مولانا مودودی، ایشیاء، مورخہ 26 اپریل 1970ء)۔ البتہ سابق امیر جماعتِ اسلامی میاں طفیل محمد نے فرمایا کہ نظریہء پاکستان مولانا مودودی نے دیا تھا (نوائے وقت لاہور 17 مئی 1976ء، مرحومہ محمودہ بیگم مودودی نے بھی یہی کچھ فرمایا، بحوالہ نوائے وقت لاہور، مورخہ 27 ستمبر اور 2,1 کتوبر 1977ء)۔۔ جبکہ اس سے قبل 1963ء میں ''تحریکِ آزادیء ہند اور مسلمان'' کے مرتب جناب خورشید احمد صاحب کتاب کے مقدمہ میں لکھ چکے تھے کہ دوقومی نظریہ کا تصور بھی مولانا نے پیش کیا تھا (حصہ اول، ایڈیشن 1984ء، ص:16) کیونکہ اہلِ جماعت اسلامی نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کے داغ دھونے کے لئے اپنی غلطیوں کو تسلیم کر لینے کی بجائے، شاید اسی میں مصلحت اور عافیت جانی کہ: نظریہء ضرورت کے تحت، دوقومی نظریہ، نظریہء پاکستان (اور پھر مملکتِ پاکستان) کا بانی مولانا ہی کو قرار دے دیا جائے۔۔ (جبکہ خود مولانا مودودی مرحوم نے بھی ان ''انکشافات'' کے بارے میں چُپ سادھ لی)۔۔ مولانا نے فرمایا: ''قائدِ اعظم کو اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ مسلمانوں کی قوت، بقا اور نشوونما کا اصل سرچشمہ اسلام ہے۔ اس لئے انہوں نے بار بار اس کا اعلان کیا کہ پاکستان میں اسلامی جمہوری نظام قائم کیا جائے گا۔'' (مولانا مودودی کا چوکھٹے میں بیان۔ نوائے وقت۔ گیارہ ستمبر 1969ء) تحریکِ پاکستان کے دوران: ''مسلم لیگ کے لیڈر، اور سب سے بڑھ کر، خود قائدِ اعظم مرحوم و مغفور نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان کا دستور قرآنی ہوگا۔'' ''قائدِ اعظم مرحوم کے متعلق مجھے کبھی یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے معاملے میں مخلص نہیں تھے۔'' ''آپ کی معلومات کے لئے اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد جب سے میں نے ملکی سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی تھی، میرے دل میں مسلمانوں کے جن لیڈروں کا احترام سب سے زیادہ تھا، ان میں سے ایک قائدِ اعظم مرحوم بھی تھے۔'' (مقالہ از مولانا مودودی۔ نوائے وقت لاہور، مورخہ 14 اگست 1976ء)، (علّامہ پرویز اور مولانا مودودی مرحومین شروع شروع میں ایک دوسرے کے دوست تھے۔ بعد میں ان کے درمیان اختلافات کی بڑی وجہ تحریکِ پاکستان کی حمایت اور مخالفت بنی)۔۔ مولانا مودودی کی تحریروں کے جو حوالہ جات آپ کو اس تالیف یا طلوعِ اسلام میں ملیں گے، وہ حوالہ جات، وہ ہیں جو ان کی تحریروں کے سامنے آتے ہی محفوظ کر لئے گئے تھے۔ ممکن ہے بعد کی اشاعتوں میں وہ کچھ مختلف انداز سے پائے جائیں، لہٰذا، اس امر کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے اور اگر کوئی صاحب وہ

حوالہ جات دیکھنا چاہیں تو مکمل سیاق وسباق کے ساتھ ادارہ طلوعِ اسلام کی محفوظ فائلوں میں دیکھ سکتے ہیں (مؤلف)۔

تجاویز:

پرویز صاحب کا مطالعہ کرتے وقت یہ امر پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ انہوں نے اپنی بصیرت کے مطابق مختلف معاملات میں اپنی تجاویز پیش کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ وہ کچھ ہے جو انہوں نے قرآن سے سمجھا ہے۔ یہ حرفِ آخر نہیں۔ لہٰذا، ان کی تجاویز کو صرف تجاویز ہی کی حیثیت حاصل ہے، نہ کہ کوئی غیر متبدل اور حتمی حیثیت۔ یہ تجاویز مختلف مقامات پر آگے آ رہی ہیں۔

حوالہ جات:

ان کے جو نظریات یہاں پیش کئے جا رہے ہیں، وہ ان کی کتب میں مختلف مقامات پر مختلف اور موثر انداز میں بکھرے پڑے ہیں۔ زیادہ تر حوالے ماہنامہ طلوعِ اسلام کے مختلف شماروں سے لئے گئے ہیں جن میں اُن کی اپنی یا ان کی تائید یافتہ تحریریں شامل ہیں اور مزید تفصیلی مطالعہ کے لئے پرویز صاحب کی متعلقہ کتب کے نام درج کر دیئے گئے ہیں۔ پرویز صاحب کا اندازِ تحریر بھی منفرد ہے۔ ان کا حوالہ دینے کا طریقہ، محولہ کتاب کا مکمل حوالہ مع سیاق وسباق، مصنف کا نام، متعلقہ صفحہ اور ایڈیشن نمبر، قدم قدم پر قرآن کریم کی آیات مع آیت نمبر اور مفہوم، اس طرح کہ آپ آسانی سے محولہ کتاب اور قرآنی آیت سے رجوع کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ دیگر حضرات بھی ایسا کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر فرق صاف نظر آئے گا۔

تکرار:

پرویز صاحب کے نظریات کی وضاحت کے لئے طلوعِ اسلام کے مختلف شماروں سے اقتباسات لئے گئے ہیں، جو، کہیں کہیں، تقریباً ایک جیسے معلوم ہوں گے اور قارئین کرام کو اکثر مقامات پر اقتباسات اور الفاظ وفقرات کی تکرار نظر آئے گی۔۔۔ اس تکرار کا مقصد نکات کی وضاحت اور پھر، مزید وضاحت ہے، لہٰذا، قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ ہر اقتباس کا مطالعہ ضرور فرمائیں اور پورے غور اور سکون سے مکمل مطالعہ فرمائیں۔ شکریہ!

آیاتِ قرآنی کی املاء:

اس تالیف میں قرآنی آیات کو پوری محنت اور کوشش سے صحیح صحیح کمپوز کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر یہ میری اپنی کوشش ہے، ہوسکتا ہے کہ کہیں کوئی غلطی رہ گئی ہو، لہٰذا، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس معاملہ میں مجھے معاف فرمائے۔ قارئین کرام سے معذرت کے ساتھ گزارش ہے کہ وہ متعلقہ آیات کے لئے قرآن کریم سے رجوع فرمالیں۔ شکریہ!

اظہارِ تشکر:

میں جناب حسین قیصرانی، منیجر ادارہ طلوعِ اسلام ٹرسٹ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے پرویز صاحب کی دیگر کتب کے علاوہ (1970ء سے 1985ء تک، سولہ سال کے) ماہنامہ طلوعِ اسلام کے مجلد شمارے مجھے میرے گھر بھجوا دیئے جو میرے پاس تقریباً تین سال تک رہے۔ اور میں نے ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ یہاں میں اپنے عزیز ملک یاسر عمران

گھانگلہ کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا جنہوں نے تقریباً ہر دوسرے چوتھے روز میرے کمپیوٹر کی خرابیاں دور کر کے مجھے اپنی تالیف مکمل کرنے میں بے حد مدد دی۔

گزارش:

قارئینِ کرام سے گزارش ہے کہ وہ پرویز صاحب کے نظریات کے بارے میں اظہارِ خیال کرنے سے پہلے اُن کے تمام نظریات کا، ترتیب وار موضوعات کے مطابق، بغور مکمل مطالعہ فرمالیں۔ دین کی، مذہب میں تبدیلی، اور اس میں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے کردار کا مطالعہ خصوصی توجہ کا مستحق ہے تا کہ معلوم ہو سکے کہ ہم موجودہ غیر پسندیدہ مقام تک کیسے پہنچے۔۔۔ اور پرویز صاحب نے کس قدر جرأت اور بے باکی سے اسلام کے خلاف مختلف سازشوں کو بے نقاب کیا ہے۔۔۔ اس کے بعد قارئین کرام کو (دنیا کے ہر شخص کی طرح) پرویز صاحب سے اتفاق یا اختلاف کا پورا پورا حق حاصل ہے (مؤلف)۔

نکاتِ فکریّہ

وحی:

تنہا عقلِ انسانی، مسائلِ زندگی حل نہیں کر سکتی۔ زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے عقل انسانی کو وحی کی راہنمائی کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو دیکھنے کیلئے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔

قرآن کریم:

قرآن کریم (وحی) ایک واضح، جامع مکمل، ہمیشہ کے لئے ناقابلِ تغیر و تبدل اور محفوظ ترین آخری آسمانی کتاب ہے۔ اس کے غیر متبدل اور ہمہ گیر اصول و قوانین ہر دور پر محیط ہیں۔ یہ کتاب ہر معاملے میں نوعِ انسان کی ابدی راہنمائی کے لئے کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلسلہء نبوت و رسالت کو ہمیشہ کے لئے حضور کریم ﷺ پر ختم کر دیا گیا۔ اب قرآن کریم پر عمل ہوگا، اللہ کی طرف سے اب کوئی مبعوث نہیں ہوگا۔

دین اور مذہب میں فرق:

اسلام مذہب نہیں، ایک دین ہے۔ دین اللہ کی طرف سے ملتا ہے جبکہ مذہب انسانوں کا وضع کردہ ہوتا ہے۔ مذہب سیکولر ہوتا ہے یعنی مذہب میں دین اور دنیا الگ الگ ہوتے ہیں جبکہ دین میں ایسا نہیں ہوتا۔ اسی لئے دین میں مذہبی پیشوائیت اور فرقوں، جماعتوں اور پارٹیوں وغیرہ کا وجود نہیں ہوتا۔ مذہب کا تعلق جذبات سے جبکہ دین کا تعلق عقل سے ہوتا ہے۔ مذہب انفرادی جبکہ دین اجتماعی نظام ہے۔ مذہب میں چند عبادات کو باقی معاملاتِ زندگی سے الگ کر دیا جاتا ہے (اور اسی کا نام سیکولرازم ہے) جبکہ دین میں زندگی کا کوئی قدم دین کے احکامات کے خلاف نہیں اٹھایا جا سکتا اور اس طرح زندگی کی تمام حرکات و سکنات کو عبادت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔۔ مذہب، دنیاوی (سیاسی اور حکومتی) معاملات سے الگ رہتا ہے جبکہ دین ایک مکمل نظامِ زندگی ہے جس میں دین اور دنیا میں فرق نہیں ہوتا اور دنیاوی (یعنی سیاسی و حکومتی) معاملات دین کے تابع

چلتے ہیں۔ آج دنیا میں ہر جگہ، اسلام بطور مذہب تو موجود ہے، بطور دین کہیں موجود نہیں۔ آج مسلمانوں کے تصورات اور نظریات و اعمال، عبادات، تقریبات و اجتماعات (تمام روحانی محافل مثلاً محافلِ شبینہ، محافلِ میلاد، رسوم ختم القرآن، تصوف کے نظریات و اعمال، تقریباتِ عروسِ بزرگان، محافلِ سماع، صوفیانہ موسیقی و عارفانہ کلام، محافلِ جذب و مستی و حال اور دھمال، محافلِ ذکر اذکار، ہر نماز کے بعد صلواۃ وسلام یا خصوصی طور پر منعقد کی جانے والی مجالس درود وسلام، مجالسِ اوراد و وظائف، جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈوں اور جادو ٹونے کے توڑ کے عملیات، تلقینِ تسلیم و رضا و مقدر پرستی، دنیاوی اور مذہبی نظامہائے تعلیم کی ایک دوسرے سے علیحدگی (یعنی سکول، کالج، یونیورسٹی اور مکتب و مدرسہ اور دارالعلوم، نیز، پی ایچ ڈی سکالرز اور علماء کا فرق)، ریاست کی اسمبلی کی قانون سازی اور مقابلے میں علماء کے دارالافتاء کے فتاویٰ، فقہ (شرعی قانون) اور ملکی قانون کا الگ الگ تصور (یعنی پبلک لاء اور پرسنل لاء کی تفریق)، عدالت کا فیصلہ اور علماء کا فتویٰ الگ الگ۔ جس کے نتیجے میں قانون دان (وکلاء) اور مفتیانِ شرعِ مبین بھی الگ الگ ہستیاں، حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ایک دوسرے سے الگ الگ ہونے کا تصور، گناہ اور جرم کو الگ الگ سمجھنا، ادائیگیء نوافل اور تسبیح و تراویح اور اعتکاف، نعت خوانیوں، قوالیوں، قرآن خوانیوں، ایصالِ ثواب، سوئم، پنجم، چہلم، محافلِ وجدان اور مراقبوں، شب بیداریوں، رقت آمیز دعاؤں، اجتماعاتِ نمازِ عید، اجتماعاتِ تبلیغی جماعت، نواحِ مکّہ مکرّمہ کے علاوہ دنیا کے دیگر مقامات پر عیدالاضحیٰ کے موقع پر جانوروں کی قربانی، صدقہ و خیرات، حتیٰ کہ اجتماعاتِ صلواۃ اور حج، الگ مساجد، الگ نمازیں، الگ ائمہ، الگ خطیب، الگ واعظ الگ پیشہ ور مبلّغ وغیرہ) کی نوعیت ''مذہبی'' ہے، نہ کہ ''دینی'' (اسلام کے دورِ اوّل میں یہ صورتِ حال نہیں تھی)۔۔۔ ایسے اجتماعات کے انعقاد اور ان میں شمولیت کا مقصد صرف (ذاتی) نجات اور بخشش ہے (جو کہ رہبانیت ہے)۔۔۔ ایسے نظریات، اجتماعات اور (مذہبی) سرگرمیوں کا تعلق دین سے برائے نام ہی ہے۔۔۔ جبکہ دین تو پوری امت، بلکہ پوری انسانیت کی فلاح کے لئے ایک مکمل نظامِ حیات (مملکت اور حکومتِ خداوندی) کے قیام کو مسلمانوں کا اولیں مقصد قرار دینے پر زور دیتا ہے (5:44) جو پوری امت کی (اجتماعی) نجات کا سبب بنتا ہے۔ ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ ہم اپنی تمام سرگرمیوں کو ''مذہبی'' کی بجائے (قرآن کریم کے تابع) ''دینی'' بنانے کی کوشش جاری رکھیں۔

مذہبی پیشوائیت:

مذہبی پیشوائیت اسلام کی سرزمین میں ایک ''اجنبی پودا'' ہے۔ یہ دورِ ملوکیت کی پیداوار ہے۔ اس کی دین میں کوئی گنجائش نہیں۔ مذہبی پیشوائیت ہی مسلمانوں میں تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ اسی نے مفاد پرست طبقات (فرعونیت، قارونیت، ہامانیت) کو اپنے فتووں سے جواز بخشا ہوا ہے۔۔ دین کو سیکولرازم (مذہب) میں تبدیل کرنے کا کارنامہ مذہبی پیشوائیت نے سرانجام دیا ہے جس سے امت فرقوں میں تقسیم ہوگئی، اور وحدتِ امت پارہ پارہ ہوگئی۔۔ یہ خود کو بزعمِ خویش، خدائی اختیارات کی حامل یعنی دین کی ٹھیکیدار سمجھتی ہے۔۔۔ مذہبی پیشوائیت (احبار و رھبان یعنی علماء و مشائخ) کی موجودگی میں دین کا نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ مذہبی پیشوائیت لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھا جاتی ہے اور خدا کی طرف جانے والے

راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہوجاتی ہے (9:34)۔

حدیث:

حدیث رسول ﷺ صرف وہی ہے جو ماانزل اللہ (قرآن) سے متصادم نہ ہو۔ کیونکہ ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ حضور کریم ﷺ کا کوئی قول وفعل قرآن پاک کے خلاف ہونہیں سکتا۔ البتہ، حدیث وحی کی کوئی قسم یا صورت نہیں۔ وحی صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے۔

تاریخ:

حضور کریم ﷺ اور اُن کے صحابہ کرام کی تاریخ کی صحت کا معیار قرآن کریم ہے۔ کیونکہ حضور کریم ﷺ اور اُن کے رفقاء کے فضائل وکردار کو قرآن کریم میں محفوظ کردیا گیا ہے۔ حضور کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے بارے میں دستیاب تاریخ میں جو واقعات قرآن کے خلاف پائے جائیں، انہیں غلط اور قرآن سے غیر متصادم واقعات کو صحیح مانا جائے۔ باقی انسانی تاریخ کا ہمارے ایمان سے کوئی تعلق نہیں۔۔ البتہ انسانی تاریخ کی دیگر مختلف (سابقہ وموجودہ) ہستیوں کے نظریات اور اعمال کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار بھی قرآن کریم ہے۔

فقہ اور اجتہاد:

غیر متبدل صرف قرآن کریم ہے۔ باقی سب کچھ قابلِ تغیر وتبدل۔ قرآن کریم کے مستقل اصول واقدار کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے ہر دور کا انسان اپنے دور کے مسائل کا حل خود ڈھونڈے گا اور اجتہاد کسی دور میں نہیں رکے گا۔ اسلاف کے فقہی فیصلے غیر متبدل نہیں۔ اقبالؒ کے مطابق اسلاف کے علمی ورثہ (سنت، فقہ قدیم وغیرہ) سے استفادہ کرنا تو ضروری ہے، لیکن اسلاف کے فیصلے (فقہ وغیرہ) بعد کی نسلوں کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ اجتہاد (فقہ یا قانون سازی) کا حق کسی فردِ واحد، گروہ، جماعت یا فرقہ کو حاصل نہیں، یہ اسلامی مملکت کا کام ہے۔

اسلامی مملکت:

قرآن کریم کا اول وآخر مقصود ایک ایسی (اسلامی) حکومت کا قیام ہے جو پوری انسانیت کے تمام مسائل کو اطمینان بخش طور پر حل کرکے دکھادے۔ اسلامی مملکت صرف وہی ہوگی جو قرآن کریم کی سورۃ المائدہ کی آیت نمبر: 44 کے تحت اس امر کا واضح اعلان کرے گی کہ اس کے تمام امور اور فیصلے ماانزل اللہ (قرآن کریم) کے مطابق انجام پائیں گے۔ جو حکومت یہ اعلان نہیں کرے گی اور اس اعلان پر عمل نہیں کرے گی وہ اسلامی مملکت اور اسلامی حکومت نہیں کہلا سکے گی۔ (یہاں یہ امر خصوصی طور پر پیشِ نظر رہے کہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ایک حقیقی اسلامی مملکت قائم کرنے کی کوشش ہر وقت جاری رکھے۔ لیکن اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ جب تک ایک حقیقی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوجاتی، اس وقت تک عبادات۔ نماز، روزہ، حج وغیرہ۔ کا ادا کرنا اور قرآن کریم کے انفرادی احکام یا عبوری دور کے احکامات پر عمل جاری رکھنا ضروری نہیں۔ ایسا سمجھنا اور کرنا کوتاہ بینی اور گمراہی کے سوا کچھ ہے۔ (جاری ہے)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

برما کے مسلمانوں کی مدد کرنا، اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے (4:75)

برما کے مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم وستم اور بربریت ہو رہی ہے اس کی خبریں پڑھ کر، ان کے حالات T.V چینلز پر دیکھ کر کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ ان پر یہ سارے مظالم صرف ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ہو رہے ہیں لیکن سخت رنج وافسوس یہ ہے مسلمانوں کے تمام ممالک، مسلمانوں کی پوری آبادی، اس قدر بے بس اور لاچار ہے کہ وہ ان کی مدد نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کی بے غیرتی اور بے رحمی کا اس سے بڑا امتحان نہیں ہوسکتا کہ سب مل کے بھی اس معاملہ میں بالکل بے بس ہیں۔ قرآنِ کریم نے جو وعدے مسلمانوں کی مدد کرنے کے کئے ہیں ان میں سے ایک وعدہ بھی روبہ عمل نہیں ہو رہا ہے۔ کیا نعوذ باللہ، اللہ کے وہ وعدے جھوٹے ہیں قرآن نے فرمایا وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ (3:139) ترجمہ: اور سُست نہ ہو اور غم مت کھاؤ، تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ (30:47) ترجمہ مومنین کی مدد کرنا ہم پر واجب ہے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے کہ ہم مومنین کو غالب رکھیں گے۔ نیز یہ بھی ارشاد ہے وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ (4:141) ترجمہ: اور اللہ ہرگز کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ کی راہ نہیں دے گا۔ اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ کافر مسلمانوں پر غالب نہیں آسکتے۔ یہ اور اس قسم کی بیشمار آیات قرآن میں موجود ہیں جن میں اللہ کی طرف سے مدد کرنے کے وعدے کئے گئے ہیں۔ قرآنِ کریم کی ان آیات کو جب ہم تلاوت کرتے ہیں تو حیرانی ہوتی ہے کہ ان آیات کی موجودگی میں مسلمانوں کی یہ حالت کیوں ہوگئی ہے۔ ہم مسلمانوں میں Free Thinkers حضرات، وہ تو پہلے سے ہی ان آیات پر شک وشبہ کرتے چلے آرہے ہیں، ہمارے علماء کرام بجائے اس کے کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب تلاش کریں، اور ان آیات کی صداقت کو ثابت کریں وہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ چونکہ مسلمانوں نے قرآن چھوڑ دیا ہے اس لئے ان کا یہ زوال ہوا ہے اور یہ کہہ کر وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنا فرض منصبی ادا کر دیا ہے لیکن یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے، اور یہی اصل سوال بھی ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑا کیوں ہے۔ ایک تو قرآن وحی الٰہی ہے دوسرے یہ کہ اس کے نظام کے بہترین نتائج سامنے آئے تھے، تو پھر مسلمانوں پر وہ کون سی مصیبت نازل ہوئی تھی کہ انہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا۔ نیز یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ چین کا ملک ہمارے آزاد ہونے کے دو سال بعد آزاد ہوا ہے۔ وہ اس کہاں پہنچ گیا ہے اور ہم کہاں زوال کی حدوں کو چھو رہے ہیں۔ چین نے کونسا قرآن پکڑ رکھا ہے کہ اس نے اس عرصہ میں اتنی ترقی کر لی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے عقائد ہی قرآن کے خلاف ہیں۔ ہمارے عقائد کوئی قوم بھی

اختیار کرے، ''انشاءاللہ'' اس کی یہی حالت ہوجائے گی جو آج ہم مسلمانوں کی حالت ہے۔ ہمارے علماء کرام ان باتوں پر غور نہیں کرتے اس لئے مسلمانوں کی تیرہ سو سال سے یہی حالت ہے اس عرصہ میں بڑے بڑے علماء و مجتہدین، بڑے بڑے مفکرین پیدا ہوئے اور سب نے مسلمانوں کو اس حالت سے نکالنے کی کوشش کی، لیکن کسی ایک مفکر کی فکر بھی کام نہ آئی، بلکہ زوال کا جو سبب تھا اس کو اور زیادہ مضبوط تھام لیا۔ یہ اس صدی کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس صدی میں تحریک طلوع اسلام وجود پذیر ہوئی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے زوال کے سبب بھی واضح کئے اور اس زوال سے باہر نکلنے کا طریقہ بھی بہت وضاحت سے بیان کیا ہے، لیکن افسوس کہ ہماری پیشوائیت نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔

زمانۂ نزول قرآن کے دوران ہر طرف، اور ہر مذہب میں روح اور روحانیت کا ہی تصور اور اس کا ہی چرچا تھا۔ قرآنِ کریم روح خداوندی کو تسلیم کرتا ہے، لیکن قرآن روح انسانی کا منکر ہے۔ لیکن مسلمانوں نے قرآنِ کریم کی اس تعلیم کے علی الرغم روحِ انسانی اور روحانیت کے عقیدے کو اختیار کیا اور روحانیت کے فروغ کو ہی زندگی کا مقصد قرار دیا۔ مسلمانوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ دماغ اس کی ترویج اور اس پر عمل کرنے سے ضائع ہی ہوئے۔ حجۃ الاسلام، امام غزالی کی اس معاملہ میں ایک منفرد حیثیت ہے۔ وہ اپنی ابتدائی عمر میں ایک فلسفی رہے۔ فلسفہ کا انہوں نے دفاع کیا اور اس پر ہی انہوں نے کام کیا۔ فلسفہ کے دفاع میں انہوں نے ایک بلند پایۂ کتاب ''مقاصد الفلاسفہ'' تصنیف کی۔ جو تصنیف ہونے کے ایک ہزار سال بعد تک اس دور تک بہت اہم سمجھی جاتی ہے، اور اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا۔ پھر امام غزالی فلسفہ سے بدظن ہوئے اور روحانیت کے حلقہ میں داخل ہوگئے، اور اس کے بعد انہوں نے کتاب ''تہافۃ الفلاسفہ'' تحریر کی جس میں انہوں نے فلسفہ پر اکیس اعتراضات وارد کئے۔ یہ کتاب بھی بہت علمی اور معیاری ہے اور اب بھی ایم اے فلسفہ میں پڑھائی جاتی ہے۔ امام غزالی کی ابتدائی نصف زندگی فلسفے کے دفاع اور اس کے فروغ میں گزری اور آخری نصف زندگی فلسفہ کی تردید اور تصوف کی تائید میں گزری۔ حاصل زندگی صرف صفر ہوا۔ اس کے باوجود ان کے نام کے ساتھ ''حجۃ الاسلام والمسلمین'' اور ''امام'' کے سابقے تحریر کئے جاتے ہیں، ہمارے ہاں یہ جتنے بڑے بڑے علماء اور اولیاء اللہ گزرے ہیں ان کی زندگی کا بیشتر حصہ تصوف زدہ تھا ہمارے ہاں برصغیر ہندو پاک میں شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خانوادے کا بڑا چرچا ہے۔ شاہ صاحب مرحوم کی ایک کتاب ''انفاس العارفین'' ہے جو صوفیوں میں بہت مقبول ہے۔ آپ اس کتاب کو مطالعہ فرمائیں، انہوں نے جو واقعات اپنے والد صاحب اور اپنے چچا کے متعلق تحریر کئے ہیں کوئی بھی Sane آدمی اس کو درست نہیں سمجھ سکتا۔ روحانیت تصوف کی ایک اصطلاح ہے، اور تصوف خود اسلام کے خلاف ہے۔ ہمارے صدرِ اوّل کے لٹریچر میں تصوف یا روحانیت کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جب مسلمانوں میں غیر قرآنی نظریات داخل ہوئے تو ان کو دین کا جزو بنا دیا گیا۔ دین کا مقصد انفرادی طور پر سیرت کی پختگی اور کردار کی بلندی ہے اور اجتماعی طور پر مستقل اقدار پر مبنی ایک نظام کا قیام ہے۔ قرآن کریم نے حضور ﷺ کے سلسلہ میں بھی روحانیت کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ آپ کے متعلق ارشاد فرمایا: وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿68:4﴾ ترجمہ: یہ حقیقت

ہے کہ آپ اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔ قرآنِ کریم نے رُہبانیت کے متعلق فرمایا کہ یہ انسانوں کا خود ایجاد کردہ عقیدہ ہے خدا کا تجویز کردہ نہیں ہے۔ زندگی (The Life) لاکھوں سال میں آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ، منزل بہ منزل، جمادات، نباتات کے مراحل طے کرنے کے بعد حیوانیت کی سطح بھی عبور کر کے آگے بڑھی اور انسانیت کے دائرہ میں داخل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف سے Energy ایک صلاحیت عنایت فرمائی جس کو قرآن نے اپنی اصطلاح میں روح کے لفظ سے پکارا ہے۔ یہ صلاحیت جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب رہتی ہے تو قرآنِ کریم اس کے لیے روح کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اور جب یہ صلاحیت نوعِ انسانی کو مل جاتی ہے تو قرآنِ کریم اس کے لیے نفس کا لفظ کہنا شروع کر دیتا ہے۔ صلاحیت تو یہ ایک ہی ہے لیکن ان دونوں الفاظ کے استعمال میں بہت باریک فرق ہے کہ جب یہ توانائی انسانیت کو بہ حیثیت ایک نوع کے مجموعی طور پر ملتی ہے تو یہ نفس کے لفظ سے تعبیر کی جاتی ہے یہ توانائی ہی انسانیت کو حیوانیت سے ممیز کرتی ہے۔ ہمارے علمائے کرام اور تقریباً ساری دنیا کے لوگ ان کو جسم اور روح کا مرکب کہتے ہیں۔ لیکن شرف تحریک طلوع اسلام کو ہی حاصل ہوا کہ اس تحریک نے روح اور نفس کے اس فرق کو Detect کیا اور یہ تحریک اس نتیجہ پر پہنچی کہ قرآن کے مطابق انسان ''جسم اور نفس'' کا مرکب ہے۔ قرآنِ کریم چونکہ روح انسانی کا قائل ہی نہیں ہے اس لئے قرآن نے روحِ انسانی کی Development کے اصول بھی نہیں بتائے۔ ہمارے علماء اور صوفیائے کرام نے خود اپنے آپ ہی روح کی Development کے اصول مقرر کر لئے۔ لیکن انہوں نے جو عقائد و اصول وضع کئے وہ سب انسانیت کو زوال پذیر کرنے، اور اس کو تباہ و برباد کرنے کے ضامن ہیں۔

(1) قرآنِ کریم نے فرمایا کہ یہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے۔ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ (29:44) اللہ نے آسماں و زمین بالحق پیدا کئے اس میں مومنین کے لیے نشانی ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴿۲۷﴾ (38:27) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے باطل پیدا نہیں کیا (کائنات کے باطل ہونے کا) ان لوگوں کا خیال ہے جو حقیقت سے انکار کرتے ہیں۔ پس ان لوگوں کے لیے جو انکار کرتے ہیں تباہی ہے۔ ان واضح آیات کے باوجود ہمارے صوفیائے کرام اور روحانین اس کائنات کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہماری اردو زبان اور فارسی زبان کی ساری شاعری اسی نظریہ پر قائم ہے کائنات کا کوئی وجود نہیں ہے۔

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

غالب کی تو ساری شاعری ہی وحدت الوجود کے عقیدے پر مبنی ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

آپ خود اندازہ فرمائیں کہ یہ حضرات جب کائنات کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کرتے تو یہ سائنس میں کیا ترقی کریں گے نہ

ہی کائنات کی قوتوں سے سفائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اسی عقیدہ کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں سائنسدان نہ ہونے کے برابر ہیں۔

روحانین کا ایک نظریہ یہ ہے کہ وہ عقل وحواس سے حاصل کردہ علم کو علم ہی تسلیم نہیں کرتے وہ صرف اس علم کو علم تسلیم کرتے ہیں جو باطنی ذرائع سے حاصل ہو۔ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں تحریر کیا ہے۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکن بود
گر بہ استدلال کارے دین بُدے فخر رازی راز دار دین بُدے

حالانکہ قرآن نے علم اس علم کو کہا ہے جو انسانی شعور وعقل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے فرمایا وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿36﴾ (17:36) تمہیں جس بات کی خبر نہیں اس کے پیچھے نہ پڑو بے شک کان، آنکھ اور عقل ان سب کی تم سے پوچھ گچھ ہوگی۔ قرآن تو علم ہی اس کو کہتا ہے جو عقل وشعور کے ذریعے حاصل ہو۔ لیکن ہمارے یہ صوفیا اس کو علم تسلیم نہیں کرتے، بلکہ جو علم کشف والہام والقاء سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کو علم گردانتے ہیں۔

(3) انہوں نے مادہ کو روح کے بالمقابل کھڑا کیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ترقی ایک ہی چیز میں ہوسکتی ہے۔ ان کے خیال کی رو سے روحانیت میں اسی وقت ترقی ہوسکتی ہے۔ جب مادہ کو بالکل ترک کر دیا جائے۔ یہ حضرات ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ مولا، ترکِ ترک کے قائل ہیں۔ انہوں نے پرستش کو روحانیت کی ترقی کا ذریعہ بنایا ہے جو جنگلوں، پہاڑوں، کونوں، گوشوں اور زاویوں میں اور وظائف کے ذریعے کی جاتی ہے۔ روحانین کو کسی معاشرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اُنہیں کسی بھی نظام سے کوئی بحث نہیں۔ خواہ نظام جمہوریت کا ہو یا کمیونزم کا، ان کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ وہ نظریات وعقائد ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو تباہ وبرباد کر کے رکھ دیا۔ چین کے ملک میں اس طرح کے عقائد کی کوئی گنجائش نہیں جس کی وجہ سے انہوں نے ترقی کی ہے۔ ان تمام عقائد کے برعکس وبرخلاف نفس کا قرآنی تصور ہے جو دنیا میں سب سے پہلی بار قرآن نے پیش فرمایا ہے۔ قرآن کریم روح کی بجائے نفس کو Recognize کرتا ہے اور نفس کی ترقی کے ذرائع وطریقے بھی خود ہی تجویز کرتا ہے۔ نفسِ انسانی کی ترقی کے دو ذرائع ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ ہر شخص قرآنِ کریم کی مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرے۔ اسلامی نظام کی اساس مستقل اقدار پر ہوتی ہے۔ مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ذات میں نشوونما بھی ہوتی ہے اور اس سے تمدنی نظام کا نظم ونسق بھی اچھا ہو جاتا ہے۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے ہم آپ کے سامنے مستقل اقدار کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

جب ذاتی مفاد اور مستقل قدر میں تصادم (Tie) پڑ جاتی ہے تو ذاتی مفاد کو مستقل اقدار پر قربان کر دینے سے ذات میں نشوونما ہوتی ہے۔ مستقل قدر یہ ہے کہ آدمی حلال کی کمائی کھائے اور حرام کی کمائی سے اجتناب کرے۔ اب فرض کیجئے کہ میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوں اور مجھے اپنے بیٹے کو کالج میں داخل کرنا ہے۔ لیکن میرے پاس داخلہ کی رقم نہیں ہے اور میں اس

معاملہ میں بالکل مجبور ہوں۔ عین اس وقت ایک سائل میرے پاس آتا ہے اور اپنا کوئی کام کرانے کے لیے ایک رقم کی پیشکش کرتا ہے۔ اب میرے پاس دو Option ہیں ایک تو یہ کہ میں مستقل قدر پر عمل کروں اور اس شخص سے رقم وصول نہ کروں۔ اور اپنے مفاد پر مستقل قدر کو ترجیح دوں، اس سے میری ذات کی نشوونما ہوگی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میں اس سائل سے وہ رقم بطور رشوت وصول کرلوں اور اپنے ذاتی مفاد کو مستقل قدر پر ترجیح دوں۔ اس صورت میں میری ذات کی نشوونما رک جائے گی۔ اس مستقل قدر پر عمل کرنے سے میری ذات کی پختگی بھی ہوگی اور اس سے معاشرہ کا نظم ونسق بھی اچھا ہوگا اور معاشرہ میں رشوت ختم ہوجائے گی۔

(2) ایک اچھے معاشرہ میں افسران ونمائندگانِ قوم اس معاشرہ میں امن وامان قائم کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ ذمہ داری ان لوگوں کے سپرد کی جائے جو اس کے اہل ہوں۔ اسے غیر ذمہ داروں کے سپرد نہ کیا جائے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ (4:58) یہ ایک مستقل قدر ہے۔ جب کوئی شخص اس مستقل قدر پر عمل کرتا ہے اور اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور معاشرہ خود اس سے بہتر ہوتا ہے۔

(3) وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) تم سے یہ پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی سے دوسروں کی فلاح وبہبود کے لیے کتنا کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ اپنی ضروت سے زیادہ سب دوسروں پر صرف کردو۔ یہ ایک مستقل قدر ہے۔ اس قدر پر عمل کرنے سے ذات کو بھی استحکام ملتا ہے اور معاشرہ بھی بہتر سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے۔

(4) وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ (2:177) ترجمہ: جب وہ وعدہ کرتے ہیں تو اُسے پورا کرتے ہیں۔ یہ ایک مستقل قدر ہے اس پر عمل کرنے سے ذات میں بھی استحکام ہوتا ہے اور معاشرہ کا نظم ونسق دونوں درست ہوتے جاتے ہیں۔

(5) ارشادِ عالی ہے اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ (5:8) ترجمہ: عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے یہ ایک مستقل قدر ہے جس پر عمل کرنے سے ذات کا استحکام اور معاشرہ کا نظم ونسق دونوں وجود پذیر ہوتے ہیں۔

نفس کی نشوونما کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ صفاتِ خداوندی کو اپنے میں زیادہ سے زیادہ پیدا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ رب ہے ہر انسان کو دوسروں کی ربوبیت کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ رازق ہے۔ ہر شخص کو دوسروں کو رزق مہیا کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کریم، رحیم، ستار، غفار، عزیز وغفور ہے۔ ہر شخص کو یہ عادتیں اپنے میں پیدا کرنی چاہئیں۔ ان صفات کو اپنی عادت بنانے سے، اور رات دن ان پر عمل کرنے سے ذات انسانی کی نشوونما ہوتی ہے، اور ان پر عمل کرنے سے معاشرہ بہتر سے بہتر ہوتا جاتا ہے۔ صفاتِ خداوندی کا تقاضہ یہ ہے کہ ان پر عمل کیا جائے اور سارے معاشرہ پر یہ نافذ اور جاری وساری ہوں۔ جس معاشرہ میں ان صفات پر عمل ہوگا اس سے بہتر معاشرہ بن ہی نہیں سکتا۔

صفاتِ خداوندی کو روبہ عمل لانے اور مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ریاست خود بخود اسلامی و قرآنی بن جاتی ہے۔ اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت ہی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اس میں نفس انسانی استحکام حاصل کرتی ہے۔ غیر اسلامی نظام میں ذات کی نشوونما ہو ہی نہیں سکتی۔ قرآنِ کریم نے اسلامی نظام کے قیام کو ہر شخص کے لیے فرض قرار دیا ہے (5:44، 42:13) چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات القوی، العزیز ہیں اس لئے اسلامی ریاست دوسری تمام ریاستوں سے مضبوط اور طاقتور ہوگی۔ قرآن کی ایک مستقل قدر یہ ہے کہ: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ (8:60) اور مسلمانوں ان کفار کے مقابلہ کے لیے جہاں تک تم سے ہو سکے، اپنے بازو کے زور سے اور بندھے ہوئے گھوڑوں سے لڑائی کا سامان مہیا کرو۔ اس سے خدا کے دشمن اور اپنے دشمن اور اس کے علاوہ دوسرے لوگوں پر بھی اپنی دھاک بٹھاؤ، جنہیں تم جانتے تک نہیں ہو۔ قرآن کریم کا یہ حکم ہے کہ اپنی حکومت قائم کرو اور وہ اتنی مضبوط ہو کہ دوسری حکومتیں اس سے ڈرتی رہیں۔ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ تم اس قوت کے ذریعہ دوسری حکومتوں کو ڈرائے رکھو۔

بہت عرصہ کی بات ہے کہ امریکہ کا ایک Cruiser (جنگی جہاز) کراچی پورٹ پر لنگر انداز ہوا۔ پاکستانی حکومت اور عوام اس کی آمد پر ناراض ہوئے اور اس کی آمد کے خلاف ایک جلوس صدر بازار میں نکالا گیا۔ جس میں امریکن حکومت کے خلاف بڑی اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔ اس جہاز میں جو امریکن سٹاف تھا وہ وقت گزاری کے لیے شہر میں گھومنے لگا۔ چند امریکن اس جلوس کے قریب بھی آ گئے۔ اُنہیں اس جلوس کے نکالنے کا سبب بھی معلوم تھا وہ ازراہِ تفریح اس جلوس کے ساتھ چلتے بھی رہے۔ لیکن چونکہ وہ امریکن تھے جو کہ ایک سُپر پاور ہے، کسی ایک شخص کی یہ جرأت نہیں ہو سکی کہ کوئی ان پر ہاتھ ڈال سکے۔ تشکیل پاکستان سے پیشتر چند صحافیوں نے قائداعظم سے یہ دریافت کیا تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد ہندوستان کے باقی ماندہ مسلمانوں کی حفاظت کی کیا صورت ہوگی۔ تو قائداعظم نے فرمایا تھا کہ جس قدر پاکستان کی حکومت مضبوط ہوگی۔ اسی قدر ہندوستان کے مسلمان Secure ہوتے چلے جائیں گے۔

اسلامی نظام جس کے مستقل حکم دیا گیا ہے کہ ہر طرح کی قوت جمع رکھو (8:60) تاکہ تمہارے دشمنوں پر تمہارا رعب طاری رہے۔ جو دشمن تمہارے سامنے ہیں صرف ان پر ہی تمہارا رعب نہ ہو بلکہ ان دشمنوں پر بھی رعب رہے جنہیں تم جانتے تک نہیں ہو۔ جب تمہاری ریاست میں اتنی قوت ہوگی تو تمہارا فرض ہے کہ تم خود ساری انسانیت کی نگرانی کرو۔ فرمایا وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (2:143) ترجمہ: اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی قوم بنایا ہے تم ساری انسانیت کی نگرانی کرو اور تمہارا (اور اس رسولؐ کے بعد اس کا جانشین تمہاری نگرانی کرے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ایک مضبوط اسلامی ریاست موجود ہو تا کہ وہ ساری انسانیت کی نگرانی کرے اور جہاں کہیں بھی ظلم ہو رہا ہو وہ مظلوم کو ظالم کے ظلم سے بچائے سورہ الحج میں ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ (22:38) ترجمہ: اللہ تعالیٰ مومنوں کی حفاظت کرتا ہے اور مومنوں سے ان کے دشمنوں کو ہٹا دیتا ہے۔ ہم نے اس مضمون میں بار بار تحریر کیا ہے کہ اللہ مومنوں کی مدد کرتا ہے اللہ کفار کو مومنوں پر غالب نہیں آنے دیتا۔ اللہ مومنوں کی

حفاظت کرتا ہے تو اللہ یہ کام خود زمین پر آ کر سرانجام نہیں دیتا۔ وہ انسانوں کی دنیا میں انسانوں کا کام انسانوں کے ذریعے ہی پورا کراتا ہے۔ یہ جو قرآنِ کریم میں ارشاد ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) زمین کے اوپر کوئی نفس ایسا نہیں ہے کہ جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر نفس کو رزق مہیا کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ آسمان سے روٹیاں پکوا کر نہیں پھینکتا، نہ زمین پر خود آ کر ہر شخص کو رزق دیتا ہے۔ بلکہ اس کا نظام اس کے Behalf پر یہ سارے کام سرانجام دیتا ہے۔ اللہ کے پروگرام انسانوں کے ہاتھوں پورے ہوتے ہیں۔ اسلامی حکومت چونکہ اللہ کے نام پر قائم ہوتی ہے اس لئے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو وعدے کئے ہیں یہ مملکت ان تمام وعدوں کو پورا کرتی ہے۔ جب مدینے میں اسلامی مملکت قائم ہوگئی تھی تو وہ مسلمان جو مکہ میں باقی رہ گئے تھے اور وہ مدینے ہجرت نہیں کر سکے تھے تو کفار نے ان پر بہت مظالم ڈھائے تو ان کی مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کی کہ اللہ ہماری مدد فرما اور ہمیں ان کفار کے ظلم سے بچا اور ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے رہنے والے ظالم ہیں۔ تو اللہ نے ان مکی مسلمانوں کو مکہ سے خود نہیں نکالا بلکہ مدینے کے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا: وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ (4:75) اور (اے مسلمانو) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ خدا کی راہ میں اور ان کمزوروں اور بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کو (کفار کے ہاتھوں سے چھڑانے) کے واسطے جہاد نہیں کرتے جو (حالتِ مجبوری میں) خدا سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے پالنے والے کسی طرح اس بستی (مکہ) سے جس کے باشندے بڑے ظاہم ہیں ہمیں نکال اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا سرپرست بنا اور تو خود ہی کسی کو اپنی طرف سے ہمارا مددگار بنا۔ اللہ کے حضور ان مظلوموں کی دعا قبول ہوئی اور مدینے کی اسلامی مملکت نے ان کی مدد فرمائی۔ اسلامی مملکت کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ جس خطے میں بھی ہو، اگر مظلوم اس کو اپنی مدد کے لئے پکاریں تو وہ ان کی مدد کرتے ہیں۔ اس میں مسلمان ہونا بھی شرط نہیں ہے کیا نہیں کسی مظلوم کی آواز کسی طرف سے بھی اُٹھے۔ اسلامی مملکت اس کی مدد ضرور کرے گی۔ کیونکہ اس اُمت کے لیے فرمایا گیا ہے کہ: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110) ترجمہ: تم بہترین قوم ہو تمہیں تمام نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس آیت میں لِلنَّاسِ کا لام، لام نافع کہلاتا ہے۔ یہ لام نفع مندی کے لیے استعمال ہوتا ہے پوری انسانیت کی بھلائی کے لیے تمہیں پیدا کیا گیا ہے تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:110) تمہارا فریضہ یہ ہے کہ پوری انسانیت کے اندر جتنی چیزیں خدا کے قوانین کے مطابق Recognize کی گئی ہیں ان کا حکم دو، تامرون کے معنی حکم دینا ہے وعظ کرنا نہیں ہے۔ تمہارے میں اتنی قوت ہو اور تم اس پوزیشن میں ہو کہ حکم دے سکو اور وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:110) تمہارے پاس اتنی قوت ہو کہ ہر وہ بات جو خدا کے قانون کے خلاف ہو اس کو روک سکو۔ یہ ہے وہ مسلمان قوم جو مظلوم کی مدد کرتی ہے۔

قرآنِ کریم میں جس قدر احکامات دیئے گئے ہیں وہ یہ Suppose کر کے دیئے گئے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک طاقتور مملکت موجود ہے اور وہ ان احکامات پر عمل کرا سکتی ہے۔ انسانوں کا کوئی گروہ یا کوئی انبوہ اس قسم کے احکامات پر عمل نہیں کرا سکتا۔ تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ برما کے مسلمانوں کی مدد کریں لیکن اس وقت مسلمان خود اس قابل نہیں کہ وہ کسی

کی مدد کرسکیں نہ ہی وہ کسی کے حق کی دادرسی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اللہ کی اطاعت کو مساجد تک محدود کر دیا ہے حالانکہ اللہ کی اطاعت مساجد کی بجائے مملکت کے مختلف اداروں کی اطاعت کرنے سے ہوتی ہے۔ اسلامی مملکت کے تھانے، تحصیلیں، عدالتیں، پارلیمنٹ یہ وہ ادارے ہیں جہاں سے قوانین خداوندی جاری ہوتے ہیں۔ اور یہ سب مساجد اللہ ہیں، ہر وہ ادارہ جو قوانین خداوندی جاری کرتا ہے۔ اس کی اطاعت اقامت صلوٰۃ کے زمرہ میں آتی ہے۔ قرآن کی رُو سے صلوٰۃ کے ان اداروں میں قوانینِ خداوندی کو جاری رکھنے کے لئے مشورے کئے جاتے ہیں (42:38) جبکہ ہمارے ہاں مسجد میں بات کرنا بالکل منع ہے اس مضمون کا ملخص یہ ہے کہ مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے دو اسباب ہیں۔ ایک سبب روحانیت کا عقیدہ ہے اور روحانیت کے حصول کے لیے پرستش کرنا اور دوسرا سبب اسلامی نظام کا انقراض ہے جب تک مسلمان روحانیت کے عقیدے کو ترک کر کے، دین کا نظام قائم نہیں کریں گے نہ اللہ کے وعدے پورے ہوں گے جو دین کے ذریعے پورے ہوتے ہیں، نہ مسلمانوں کی حالت درست ہوگی اور نہ یہ کسی کی مدد کرنے کے قابل ہوں گے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اللہ کی اطاعت کا ایک ہی طریقہ ہوسکتا ہے۔ اس کی اطاعت کے دو مختلف و متضاد طریقے نہیں ہوسکتے۔ جو مسلمان روحانیت کے قائل ہیں وہ اللہ کی اطاعت پرستش کے ذریعہ کرتے ہیں اور وہ اطاعت اور پرستش کے فرق کو نہیں سمجھ سکتے اور عبادت کے معنی پرستش یا پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ حضرت شیخ الہند نے اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۱۱۴﴾ (16:114) کا ترجمہ اگر تم اس کو پوجتے ہو کیا ہے۔ قرآن کریم اطاعت خداوندی کا طریقہ اس کے نظام کی اطاعت کو قرار دیتا ہے۔ نظام کی اطاعت کے علاوہ اللہ کی عبادت کسی اور طریقہ سے ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتی۔ اسلامی نظام کے ہر حکم کی اطاعت عبادتِ خداوندی ہے۔ جب آپ اسلامی نظام کے احکامات کی اطاعت کرتے ہیں تو وہ ہی عبادت خداوندی ہے۔ پھر پرستش کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ جب آپ اس نظام کے Revenues ادا کرتے ہیں، بجلی کا بل، پانی کا بل، ٹی وی اور کمپیوٹر کا بل ادا کرتے ہیں تو یہ عبادت خداوندی ہوتی ہے جب تک آپ نظامِ خداوندی کی اطاعت کو عبادت خداوندی نہیں قرار دیں گے، اس وقت تک دین قائم نہیں ہوسکتا۔

اس وقت مسلمانوں کے سامنے صرف ایک راستہ باقی ہے کہ آپ پرستش کو بالکل ترک کر دیں اور اقامت دین کی پوری پوری کوشش کریں۔ جو لوگ جہاں بھی اور جب بھی اقامتِ دین کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا بہت بلند مقام ہوتا ہے۔ ان کا درجہ و مقام والذین معہ کے برابر ہوتا ہے۔ اقامتِ دین میں جن لوگوں نے حضور ﷺ کا ساتھ دیا تھا۔ ان کا جو مرتبہ و مقام تھا، اس دور میں، اور ہر دور میں اقامتِ دین کی کوشش کرنے والے کا ہوگا۔ اقامت دین اور ہجرت کرنیوالوں کا ہر دور میں ایک درجہ ہوگا اس نظریہ میں ہم منفرد نہیں ہے۔ اس بات کی وضاحت معارف القرآن اور تفسیر نمونہ نے بھی اسی طرح کی ہے۔ ان دونوں تفاسیر نے ہمارے موقف کی تائید کی ہے۔

شعور آدمیت نا زکر اس ذات اقدس پر ۔۔۔ تری عظمت کا باعث ہے، محمد ﷺ کا بشر ہونا

ڈاکٹر محمد راحیل اکبر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(گذشتہ سے پیوستہ)

نوعِ انسانی امتِ واحدہ ..... ایک قرآنی تصور

All Humans as One Nation, The Quranic Concept

قرآنِ کریم اور قوت کا استعمال:

☆ یہ سمجھنا غلط ہے کہ تغلب ہر قسم کا ناجائز اور خلافِ شرفِ انسانیت ہے۔ تغلب کی دو قسمیں ہیں یعنی (Benign Aggression) جائز، اور (Malignant Aggression) مذموم۔ شیر اگر فطرت کے تقاضے کے مطابق اپنی بھوک مٹانے کے لیے ہرن پر حملہ کرتا ہے تو یہ کوئی جرم یا ناجائز فعل نہیں۔ لیکن اگر کوئی شکاری (بھوک کے لیے نہیں بلکہ) محض تفریح کی خاطر ہرن پر گولی چلاتا ہے تو اخلاقی ضابطۂ نگاہ سے یہ مذموم تغلب ہوگا۔ اگر کوئی ظالم کسی مظلوم کے سینے میں چھرا گھونپنے کیلئے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اس کا یہ اقدام مجرمانہ ہے لیکن اگر کوئی شخص اس مظلوم کی جان بچانے کے لیے اس ظالم کی کلائی مروڑ دیتا ہے، یا اس کی مزاحمت پر اسے گولی مار دیتا ہے، تو یہ تغلب نہ صرف یہ کہ ناجائز نہیں بلکہ انسانیت کی حفاظت کیلئے ضروری بھی ہے۔

☆ اور یہی ہے وہ تغلب جس کی قرآنِ کریم نے نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ عندالضرورت اس کی تاکید بھی کی ہے۔ قرآنِ کریم کے نزدیک انسانی جان کی قیمت کتنی بڑی ہے۔ اس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ ''یاد رکھو! جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق ہلاک کر دیا (یعنی بجز اس کے کہ اسے جرمِ قتل کی سزا کے لیے ہلاک کیا جائے یا فساد کو روکنے کی خاطر) تو یوں سمجھئے گویا اس نے پوری نوعِ انسانی کو ہلاک کر دیا۔'' اور جس نے کسی ایک کی جان کو بھی ہلاکت سے بچا لیا تو یوں سمجھئے گویا اس نے تمام نوعِ انسان کو زندگی عطا کر دی۔'' ایک طرف تو اس کے نزدیک انسانی زندگی کی یہ قدر و قیمت ہے، لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کوئی سرکش اور مستبد انسان، یا انسانوں کا گروہ، مظلوم اور کمزور انسانوں پر گوشۂ عافیت تنگ کر دے اور ان کی ہلاکت و تباہی پر اتر آئے تو اُسے اس ظلم و استبداد سے روکنے کے لیے پہلے سمجھانا چاہیئے اور اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئے تو قوت کے زور سے اسے اس دراز دستی سے روک دینا چاہیئے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس قسم کی جنگ کو ''قتال فی سبیل اللہ'' (یعنی نوعِ انسان کی حفاظت کے لیے اللہ کی راہ میں جنگ) کہہ کر پکارا گیا ہے۔

مذہب کی آزادی اور جماعتِ مومنین:

☆ قرآنِ کریم زبردستی کسی کو مسلمان نہیں بناتا۔ وہ ہر کسی کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہاں تک کہ قرآنِ کریم نے جہاں تین مواقع پر، جنگ یا جہاد کی اجازت دی ہے، وہاں ایک وجہ مذہب کی آزادی قائم رکھنا بھی ہے۔ اگر جماعت مومنین دیکھے کہ کوئی ظالم کسی مذہب کی عبادت گاہ، گرجا، مندر یا مسجد کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے تو جماعتِ مومنین یا اسلامی فوج اپنی جان دے کر بھی، مخالف مذہب کی عبادت گاہ کو بچائے گی۔ اور اگر دنیا میں کوئی ایسی قوم نہ ہو جو دوسروں کی مذہبی آزادی Ensure کر سکے تو دنیا میں کسی بھی مذہب کی عبادت گاہیں قائم نہ رہتیں۔ انسان آپس کے اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کی مسجد، مندر، گرجے گرواتے رہیں۔

قرآنِ کریم کی اقدار اور اصول پر عمل سے انسانوں کے درمیان فساد ختم ہو جاتا ہے۔ ہر کسی کو ضرورت کے وقت رزق حفاظت اور امن مل جاتا ہے۔

☆ قرآنِ کریم کے مطابق جماعتِ مومنین یا اسلامی حکومت کی ڈیوٹی یہ ہے کہ دنیا بھر میں جہاں کہیں کوئی مظلوم انسان، خدا کو مدد کے لیے بلائے تو اسلامی حکومت کی فوج اس انسان کی مدد کے لیے پہنچے گی۔

☆ اللہ ظالم اور مظلوم دونوں کا خدا ہے۔ اللہ ظالم کو توبہ کا موقع اور آخری تباہی سے پہلے اصلاح کے لیے مہلت کا وقفہ دیتا ہے۔ اللہ رب العالمین ہے۔ کسی خاص مذہب، نسل، رنگ کے انسانوں کا خدا نہیں محمد ﷺ ساری دنیا کے انسانوں کیلئے نبی، Role Model، راہنما، رسول اور ساری کائنات میں تمام انسانوں کے لیے رحمت للعالمین ہیں۔

☆ اگر انسان کو اپنی دنیا میں امن لانا ہے، فساد اور جھگڑے ختم کرنے ہیں، بھوک بیماری کی بجائے ہر انسان کو روٹی اور علاج مہیا کرنا ہے تو پھر اس کو قرآنی اقدار اور اصول کے مطابق اپنے معاشرے کے قوانین بنانے ہوں گے۔ انسان کو کامیابی صرف خدا کے قرآنِ پاک میں بتائے قوانین کے ذریعے ہی مل سکتی ہے۔

☆ قرآنِ کریم چاہتا ہے کہ پوری نوعِ انسانی کا مفاد سامنے رکھتے ہوئے پوری نوع انسانی کی ایک واحد امت تشکیل دی جائے۔ کوئی انسان صرف اپنے ملک کے انسانوں کے فائدے کا نہ سوچے۔ اپنے ملک کے انسانوں کے فائدہ کیلئے کسی دوسرے ملک کے انسانوں کی بربادی، تباہی کے سامان نہ کرے۔ کوئی شخص کسی ملک، کسی نسل، کسی مذہب کی بنیاد پر انسانوں میں تفرقہ نہ ڈالے۔ انسانوں کے درمیان اتفاق محبت ہو۔ ایک دوسرے کی مخالفت نہ ہو۔ یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ صرف امریکیوں کو اعلیٰ ترین سہولتیں روٹی کپڑا مکان علاج تعلیم ملے اور افریقہ و ایشیاء کے انسان بھوکوں مریں۔ کسی نے خوب کہا تھا کہ ہم لوگ وطن کے نام پر جو اجتماعی گناہ کرتے یا تباہیاں لاتے ہیں، یہی کچھ اگر کوئی انسان ذاتی حیثیت میں کرے تو دنیا کا سب سے بڑا شیطان کہلائے۔ اقبال کے الفاظ میں ''ان تازہ خداؤں میں وطن سب سے بڑا خدا ہے''

آخرت پر ایمان سے معجزے:

☆ تمام انسان دنیا کو چلانے والی ایک Super Power کو تسلیم کرتے ہیں۔ اپنے اپنے انداز میں پوجا پاٹ عبادت کر کے تمام انسان دلی سکون حاصل کرتے ہیں۔ کوئی مندر میں گھنٹی بجا کر اور کوئی انسان رکوع وسجود سے سکون حاصل کرتا ہے۔ لیکن ہر مذہب والے کے تصور میں ایک Super Power کا تصور ہے لیکن یہ خدائی تصور مختلف مذاہب کے انسانوں کا مختلف ہے۔

ہر مذہب کے انسان آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور آخرت میں کامیاب ہونے کیلئے دنیا میں اچھے اعمال بھی کرتے ہیں۔ قرآنِ پاک نے انسانی جسم کے علاوہ انسانی ذات کا تصور بھی دیا۔ دنیا بھر کے ہر انسان کو پیدائش کے ساتھ ہی ایک Undeveloped Form میں ایک ذات عطا کی جاتی ہے اور آخرت کی Higher Form of Life حاصل کرنے یا Achieve کرنے کے لیے، اس کو اس ذات کی نشوونما (Development) کرنے کی شرط پوری کرنی ہوتی ہے۔

☆ ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے مادی جسم کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جو ہم کھاتے ہیں یا دوسرے انسانوں سے لیتے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم کے مطابق اس مادی جسم کی نشوونما کے اصول کے بالکل برعکس انسانی ذات کی نشوونما، ہر اُس چیز سے ہوتی ہے جسے انسان دوسروں کی نشوونما کے لیے دیتا ہے۔ طبعی زندگی کے لیے لینا ضروری ہے لیکن انسانی ذات کی نشوونما کے لیے اصول ''دینا'' ہے۔

☆ جماعت مومنین کے لیے نفع بخشی کے تصور میں یہ دیکھا جائے گا کہ یہ چیز صرف انسانی جسم کے لیے نفع بخش ہے یا یہ اس کی ذات کے لیے بھی نفع بخش ہے۔ اگر کوئی چیز اس کی ذات کو نقصان پہنچاتی ہے وہ چیز مسلم انسان کے لیے حرام ہے۔ جہاں بھی جسم اور ذات کی نفع بخشی کے درمیان مقابلہ ہو جائے، وہاں عبدِ مومن ذات کو اولیت دے گا۔

☆ انسانی ذات کی زیادہ سے زیادہ نشوونما کے لیے ہر کوئی جان لگا کر، زیادہ سے زیادہ محنت کرتا اور زیادہ آمدنی حاصل کرتا ہے اور زکوٰۃ خیرات کے طور پر اسلامی حکومت کو دیتا ہے تا کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو اور وہ آخرت میں جنت حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔ اسلامی حکومت وہ زکوٰۃ خیرات (رزق) صحیح طریقہ سے تقسیم کرتی ہے کہ دنیا کا کوئی شخص بھوکا نہ رہے۔ دنیا کے تمام انسان ایک جیسی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یورپ والوں نے ملکوں کی سرحدوں کی لکیریں ہٹا دی ہیں۔ سب یورپ کے انسانوں کیلئے برابر کے مواقع ہیں۔ یہی کچھ ساری دنیا میں ہونا چاہیئے۔ اپنی ذات کی نشوونما اور آخرت میں کامیابی کی لالچ کا عالم یہ ہے کہ مسلمان خود تنگی ترشی میں گزارا کر لیتا ہے لیکن دوسرے کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ یہ آخرت پر ایمان ہے، جس کے تحت ایک انسان اپنی ضروریات کو دوسرے انسان کی ضروریات پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ صرف قرآنِ کریم کی تعلیم کا اعجاز ہے۔ ان قرآنی اقدار واصول وقوانین کے بغیر، ہر انسان دوسرے جانوروں کی طرح درندہ ہے جو سب کچھ اپنے لیے سمیٹ کر رکھنا چاہتا ہے پھر اپنے بچوں کے لیے بھی سمیٹنا چاہتا ہے۔ وہ دوسروں کو دھکا دے کر، دوسرے انسانوں کی گردن پر پاؤں رکھ کر آگے بڑھنا چاہتا ہے لیکن قرآن کی تعلیم وتربیت اُسے دکھاتی ہے کہ جو انسان بھی اس جذبہ سے محفوظ رہے گا، وہی کامیاب ہوگا۔ دوسروں کو دھکا دے کر خود آگے بڑھنے کی بجائے کسی دوسرے انسان کی ضرورت پوری کرنے

کیلئے خود پیچھے ہٹ جانا ہی انسانی قدر ہے۔

☆ دوسرے انسانوں سے مراد صرف اپنی جماعت، اپنی پارٹی، اپنی قوم، اپنے مذہب کے افراد ہی نہیں ہیں بلکہ تمام دنیا میں بسنے والے تمام انسان ہیں۔ اللہ نے پیدائش کے اعتبار سے ہر انسانی بچہ کو عزت و تکریم کا مستحق قرار دیا۔ غریب کی جھونپڑی اور بادشاہ کے محل میں پیدا ہونے والا بچہ دونوں برابر کی عزت رکھتے ہیں۔ دونوں کی ماں کی چھاتیوں میں بچہ کی پیدائش کے ساتھ ہی برابر کا دودھ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ امیر غریب دونوں کی پرورش کا انتظام اللہ تعالیٰ نے رحمِ مادر میں ایک جیسی شفقت اور رحمت سے کیا تھا۔

☆ ساری دنیا میں انسانوں کے مفاد کے درمیان تصادم ہوتا ہے۔ تعمیری (خیر) اور تخریبی (شر) دونوں قسم کی قوتیں لڑتی ہیں۔ دونوں کے درمیان کشمکش رہتی ہے۔ جو چیز بھی تمام نوعِ انسانی کے لیے نفع بخش ہے وہ قائم رہتی ہے جو چیز بھی تمام نوعِ انسانی کی بھلائی کیلئے ہے خیر ہے۔ جو نظام بھی انفرادی لالچوں سے بچ جائے گا اور تمام نوعِ انسانی کا مفاد سامنے رکھے گا، وہ نظام باقی رہے گا۔ یہی قرآن کریم کی تعلیم ہے۔

☆ یہاں تک کہ فلاح و بہبود کے کاموں کو صرف اپنی پارٹیوں، گروہوں، ملکوں اور قوموں کے لیے محدود کر لینا بھی قرآنی اقدار کے منافی ہے۔ بقا دوام صرف اس عمل کو حاصل ہے، جو تمام عالم انسانیت کے نفع بخشی کیلئے کیا جائے۔

☆ منشائے خداوندی کے مطابق صحیح زندگی یہ ہے کہ خدا کے عطا فرمودہ رزق کے سرچشموں سے بقدرِ ضرورت لیا جائے اور اس سے زیادہ پر قبضہ کر کے معاشرہ کا توازن نہ بگاڑا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی ضروریات کے لیے مناسب رزق زمین میں پھل، پھول، سبزیوں، جانوروں کی صورت میں پھیلا دیا ہے۔ انسانوں کا نظام ایسا بنایا ہے کہ رزق کی تقسیم ایسی ہو، جس میں ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق لے لے۔ قرآنی نظام تمام انسانوں اور اُن کی اولاد تک کی رزق کی ذمہ داری اٹھاتا ہے چنانچہ انسان کو اپنا پیٹ بھرنے کے بعد، اپنے بچوں کے لیے لوٹ کھسوٹ سے، دھونس دھاندلی سے، سلب و نہب سے، حلال و حرام تمام طریقوں سے اکٹھا کر کے سمیٹ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ذخیرہ کر کے کمر پر باندھ کر ساتھ نہیں لے جانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اجازت ہے۔

You can eat, make use of available things, but can not possess them.

اگر ہر کوئی اپنے لیے رزق کو چھپا کر جمع کر کے رکھے تو معاشرہ میں فساد پڑ جائے گا۔ اللہ نے قرآنِ کریم میں وحی کے ذریعے جو پروگرام دیا ہے اس کے مطابق تمام انسان قرآن کی اقدار و اصول پر عمل کریں تو دنیا میں فساد ختم ہو سکتا ہے۔

جنگ کی بنیاد نیشنلزم ہے My Country - Right or Wrong:

☆ جس طرح افراد میں باہمی تنازعہ کی بنیاد جذبۂ انانیت ہوتا ہے۔ مسئلہ کس قدر پیچیدہ کیوں نہ ہو، یہ واقعہ ہے کہ ہمارے دور کی دونوں عالمگیر لڑائیاں، نیشنلزم کی پیدا کردہ ہیں۔ اور یہی ہمارے زمانے میں سب سے بڑی سیاسی قوت ہے۔ ان دونوں عالمگیر جنگوں کی تہہ میں یہی اصول کارفرما تھا جس کی رو سے دنیا کو آزاد قومی مملکتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور جس

کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مختلف مملکتیں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر کرتی ہیں۔ اور اس طرح ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہیں۔ ان حالات میں کبھی صالح معاشرتی نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ اور رونا صرف یہی نہیں کہ یہ دو عالمگیر لڑائیاں کیوں ہوگئیں۔ رونا تو اس بات کا ہے کہ جب دنیا میں جنگ نہیں ہو رہی ہوتی، تو اس وقت بھی امن قائم نہیں ہوسکتا۔ ''نیشنلزم، انسانی تاریخ میں فساد کی سب سے بڑی جڑ ہے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے کوئی فساد انسانیت نہ عالمگیر ہوا کرتا تھا نہ انسانی زندگی کو کلی طور پر محیط۔ نیشنلزم، فساد اور خون ریزی میں یہ باہمی تعلق ہے۔

پوری انسانیت کیلئے کرہ ارض مستقر رہے۔ انسانوں سے کہا گیا ہے کہ اگر زمین کے ایک حصہ میں حالات نامساعد ہوں تو پاؤں توڑ کر نہ بیٹھے رہو، دوسرے خطہ ارض میں چلے جاؤ۔ تقریباً تمام انبیاء نے یہی کیا۔ یہی ہجرت کا اصول ہے۔ آج کی دنیا میں انسان غلط نظام کے تحت اپنے ہاتھوں کے بنائے زندانوں میں گرفتار ہے۔ ہر ملک ایک قید خانہ ہے، جس کے بارڈر کو کوئی انسان پار نہیں کرسکتا۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں ہیں محبوس خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار

اقبال

انسانوں کے لیے وطن کی لکیرون کی قید نہیں ہونی چاہیئے۔ تمام انسان برابر ہیں اور برابر کے حقوق رکھتے ہیں۔ انسانوں میں تفریق جغرافیائی لکیروں کی وجہ سے نہیں ہونی چاہیئے بلکہ شریف اور بدمعاش انسان کے درمیان ہونی چاہئے۔ اور بدمعاش انسان کے بھی حقوق سلب نہیں جانے چاہئیں۔ بلکہ اُس کا نفسیاتی علاج کر کے دوبارہ فعال بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ

قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

انسانوں نے اپنے ہاتھوں ایسی کیفیت پیدا کردی ہے کہ تمام کرہ ارض جہنم بن گیا ہے۔ مجرم کی بھی انسانیت قابلِ تکریم ہے، جرم قابلِ مذمت، حضور ﷺ نے مکہ میں وہ نظام، سسٹم یا حکومت قائم کی جو تمام انسانیت کو ایک امتِ واحدہ تصور کرتی تھی اور تمام دنیا کے انسانوں کے لیے قرآن کریم کے ذریعے ہر قسم کے امن کی ضمانت دیتی تھی۔ یہ کہنا کہ کعبہ میں آجاؤ تو امن مل جائے گا سے مراد خانہ کعبہ، مکہ یا کوئی خطہ نہیں بلکہ مکہ میں قائم، تمام دنیا میں امن قائم کرنے والی پہلی حکومت تھی۔

یورپی یونین کی مثال:

☆ یورپ والے قرآن پاک کی تعلیم سے واقف ہیں۔ اُن کے سامنے انسانوں کی واحد امت کا تصور موجود ہے۔ ہم European Union کی صورت میں عملی طور پر یہ دیکھ رہے ہیں یہ وہ Welfare States ہیں جہاں کوئی بھوکا نہیں سوتا۔ کوئی شخص ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں۔ ہر ایک کے لیے روزگار مہیا کیا جاتا ہے۔ بے کاروں کو روزگار الاؤنس ملتا ہے۔ بوڑھوں کو پنشن ملتی ہے۔ بیماروں کا علاج مت ہوتا ہے۔ بچوں کی تعلیم مفت ہے۔ ہر کسی کے لیے مکان موجود ہے۔ اب

ان لوگوں نے اکٹھے ہو کر اپنے ملکوں کی سرحدوں کو مٹا دیا ہے۔ Visa کی پابندیاں ختم کر دی ہیں۔ سارے ملکوں کے سارے انسانوں کو یکساں مواقع اور عزت مل رہی ہے۔ لیکن یہ سب سہولتیں صرف ان ہی کے ملکوں کے انسانوں کیلئے ہیں۔ کوئی افریقی ایشیائی کالا غریب ان کے ملک میں قدم نہیں رکھ سکتا۔

ان کے ہاں افراد کے حقوق کا جذبہ محرکہ نیشنلزم (Nationalism) ہے۔ نوعِ انسانی کا ایک امتِ واحدہ ہونے کا تصور نہیں ہے یورپ امریکہ کی اقوام اپنی اپنی قوم کو زیادہ سے زیادہ خوش حالیاں پہنچانے کی فکر میں رہتی۔ اپنی قوم سے باہر کے انسانوں کا سلب ونہب Exploitation ان کے نزدیک جائز ہے۔ اس بات کا اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب ایک قوم کا مفاد دوسری قوم کے مفاد سے ٹکراتا ہے۔ وہ قوم انسانیت کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر درندوں کی طرح مخالف قوم پر جھپٹتی ہے۔ یورپ امریکہ کی اقوام جو اس قدر مہذب ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں انسانیت کے تقاضے تو ایک طرف رہے عام معاشرتی اصول وآداب کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ اور ایسے انسانیت سوز حربے استعمال کرتی ہیں جس سے آدمیت خون کے آنسو روتی ہے۔

حکومتوں اور سکالرز کی سوچ میں فرق:

یہ تو یورپ امریکہ کی حکومتوں کا حال ہے لیکن اب کے مفکر سکالر اپنے عقلی اور منطقی انداز سے انسانیت کے امتِ واحدہ ہونے کی حقیقت پر پہنچ گئے ہیں۔ وہ سمجھ گئے ہیں کہ دنیا سے فساد ختم کر کے امن قائم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ تمام انسانوں کو برابر سمجھا جائے اور دنیا بھر کے انسان صرف ایک قانون کو Follow کریں۔ وہ واحد قوانین کونسے ہوں گے جو تمام نوعِ انسانی کیلئے قابلِ قبول، قابل عمل اور انسانوں کی کامیابی، فلاح، ترقی کے نتائج پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں گے، یورپ کے سکالر نہیں جانتے۔ کیونکہ ان کی تمام مذہبی کتب محرف ہو چکی ہیں۔ اس وقت قرآنِ کریم واحد الہامی کتاب ہے جو ضروری قوانین کے لحاظ سے مکمل ہے اور محفوظ بھی ہے۔ تمام نوعِ انسانی ایک امت کی طرح صرف قرآن کے قوانین پر عمل کر کے امن خوشحالی سکون اطمینان کی منزل پا سکتی ہے۔

☆ آج ہم دنیا بھر میں فساد، تخریب کاری، دہشت گردی اور جنگ دیکھتے ہیں تو اس کی وجہ انسانوں کے باہمی مفادات کی جنگ ہے۔ ہر شخص صرف اپنے لیے زیادہ سے زیادہ دولت خوراک سمیٹنا چاہتا ہے۔ اسے دوسرے کے نقصان سے کوئی غرض نہیں۔ اگر تمام انسان برابر کے حق دار بھائی بھائی بن گئے یعنی امتِ واحدہ ہو گئے تو ہر انسان کا مفاد دوسرے کا مفاد بن جائے گا۔ رزق صرف اپنے لیے سمیٹ کر رکھنے کی بجائے مل بانٹ کر کھانے کا تصور آ جائے گا۔ اگر کھائیں گے تو ایک جیسا اکٹھے کھائیں گے۔ اگر ایک بھوکا رہے گا تو دوسرا بھی بھوکا رہے گا۔ یہاں تک کہ کسی ملک کیلئے جنگ، فوج، ہتھیار رکھنے یا ظلم، زیادتی، فساد، جھگڑے، کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ موجودہ جنگ تو ہے ہی آپس کے مفادات کی جنگ۔

☆ ساری کائنات میں، واحد اللہ تعالیٰ، تمام انسانوں کا خدا ہے۔ تمام انسانوں کے لیے ایک ہی قانون ہے جو قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ مفاد خویش کی بجائے، تمام انسانوں کی بھلائی اور خیر کے کام کرنے سے ہی انسانوں کو امن اور بقا مل سکتی

ہے۔قرآن کے مطابق تمام نوعِ انسانی ایک امت ہے اور اس کی کامیابی کے لیے ایک ہی قانون، قرآنی اقدار و اصول کی صورت میں جو ہمارے پاس موجود ہے۔ان قرآنی قوانین کو نفاذ کرنے اور دنیا بھر میں تمام انسانوں کے لیے انصاف یقینی بنانے کے لیے ایک ایسی جماعت مومنین کی ضرورت ہے جو قوت نافذہ بھی رکھتی ہو، محض وعظ و نصیحت کرنے والی نہ ہو۔جو امریکیوں کی طرح ایران، عراق، افغانستان والوں کو انسانوں کی تباہی کے لیے Weapon of Mass Destruction بنانے سے روکے United Nations کی صورت میں مہذب قوانین تمام دنیا میں نافذ کرے اور قوموں کے اعمال کی نگران ہو، کی ضرورت ہے۔

عمرہ و حج کا اصل مقصد:

عمرہ سے مراد محض بیت اللہ کے گرد چند رسومات ادا کر لینا نہیں ہے بلکہ عمرہ سے مراد وہ چھوٹی چھوٹی Conferences ہیں جن میں امتِ مسلمہ، نوعِ انسانی کے بھلائی کے کاموں کے بارے میں ہنگامی بات چیت ہوتی ہے اور حج وہ سالانہ اجتماع ہے جس میں دنیا بھر سے لوگوں کو بلایا جاتا ہے کہ آؤ دیکھو ہم نے نوع انسانی کی ترقی کے لیے کیا کیا Technologies Develop کی ہیں۔ہم یہ Technology صرف اپنے لیے چھپا کر نہیں رکھ رہے۔آپ کو یہ Technology جاسوسوں کے ذریعے چوری کرنے کی ضرورت نہیں۔ہم نے اسے ساری دنیا کے لیے کھلا رکھا ہے۔حج کے میلہ میں آنے والا ہر ملک کا ہر شہری اس Technology سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ہم ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم کی Technology عام نہیں کریں گے لیکن ایٹمی بجلی گھر کی Technology سب کے لیے عام کریں گے تاکہ گاؤں گاؤں بجلی جائے، ٹیوب ویل چلیں، فصلیں ہوں۔آپ خود بھی بھوکے نہ رہیں اور جب ہم کو ضرورت ہو تو آپ ہمیں دے سکیں۔یعنی انسانیت کی بھلائی کی Technology ساری انسانیت کیلئے ہے۔کیونکہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔سب انسان برابر ہیں۔امتِ واحدہ ہیں۔کوئی مقابلہ نہیں، کوئی بغض نہیں، کوئی عداوت نہیں، کسی فوج، جنگ یا ایٹم بم کی ضرورت نہیں۔حج کا اصلی مقصد تھا اقوامِ عالم کو دعوتِ عام دینا کہ آؤ دیکھو ہم نے دنیا کو بہتر بنانے کیلئے کیا کام کئے ہیں۔آؤ بطور انسان آؤ، بیٹھو سوچو انسانیت کی بہتری کیلئے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔

مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟

''نوعِ انسانی امت واحدہ'' مشکل کا حل اور کرنے کا کام:

☆ جب انسان نے پہلے پہل اس زمین پر تمدنی زندگی شروع کی اور اس کے بعد اس کی آج کی زندگی پر غور کیجئے۔آپ کو صاف نظر آ جائے گا کہ اس نے کائنات کے گیسوؤں کو کس طرح سنوارا ہے۔انسان نے اس خارجی کائنات کے حسن میں، کس قدر اضافہ کیا ہے۔انسانی تاریخ کے یہ دونوں گوشے باہمد گر اس قدر متضاد و متخالف ہیں کہ ان پر غور کرنے سے انسان محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ ایک گوشے میں اس قدر بلندی اور دوسرے میں اس قدر پستی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ تسخیرِ کائنات تو اس علم کی رُو سے کی جا سکتی تھی (اور اگر کر لی گئی) جس کی تحصیل کی صلاحیت اس کے اندر رکھ دی گئی تھی۔لیکن اس کی ذاتی اور تمدنی زندگی صحیح خطوط پر صرف وحی کے ذریعے متشکل ہو سکتی تھی جسے انسان نے نظر انداز کر دیا۔اس کا عبرت آموز نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔زندگی کی شب تاریک تو، سائنس کے علوم سے نہیں، وحی کی شمعِ جہانتاب ہی سے روشن ہو سکتی ہے۔اقوامِ مغرب

آج اس روشنی کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ اے کاش! کوئی اللہ کا بندہ شمعِ قرآنی ہاتھ میں لے کر اُن کی راہنمائی کرے تو آدم کو پھر سے وہ جنت مل جائے، جس کی بازیابی کے لیے وہ اس قدر وقف اضطراب ہے۔

☆ قرآنِ پاک کی آیت ہے ''تمام انسانیت ایک امت کی طرح ہے (2:213)'' اس قرآنی تصور کی راہ میں حائل مشکل وطنیت کا تصور ہے۔ جس طرف علامہ اقبال نے یوں اشارہ کیا ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اس مشکل کا حل وطنیت کی لکیریں مٹا کر تمام وسائل دنیا کے تمام انسانوں کے لیے یکساں تقسیم کرنا ہے۔ اس کیلئے تمام انسانوں کے لیے یکساں قانون کی ضرورت ہے اور یہ قانون انسان خود نہیں بنا سکتے۔ یہ قانون انسانوں سے بالا صرف خدا دے سکتا ہے۔ جو تمام انسانوں کے لیے قابل قبول ہو۔ یہ قوانین اس وقت صرف قرآنِ پاک میں مکمل، محفوظ اور آخری قوانین باقی تمام مذاہب کی کتب محرف ہو چکی ہیں۔

اگر کوئی انسان اپنے لیے یہ قوانین بنائے گا تو غیر شعوری طور پر ہی سہی، کہیں نہ کہیں اپنی قوم کی جذباتی طور پر رعایت کر جائے گا۔ اس لیے انسانوں کے قانون انسان سے بلند ذات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہونا چاہئیں چنانچہ نوعِ انسانی کو امت واحدہ بننے کے لیے جس ایک قانون پر آنا ہے وہ قوانین اب صرف قرآن پاک میں محفوظ ہیں۔ ان قوانین کے سوا کوئی اور قوانین ہو نہیں سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اقوامِ مغرب کو قرآن کریم کی تعلیم سے روشناس کرایا جائے تاکہ وحی کی راہنمائی میں پوری نوعِ انسانی امتِ واحدہ کی منزل تک جلد از جلد پہنچا جا سکے۔ اِس طرح عالمگیر انسانیت کو اس تباہی سے بچایا جا سکے جو تیسری عالمگیر جنگ کی صورت میں انسانیت کا مقدر ہو بن سکتی ہے۔

نوٹ 1: انبیائے کرامؑ کے اس مقصد کی وحدت کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا گیا ہے کہ یہ حضرات ایک ہی دین لے کر آئے تھے..... اور دین کا منتہیٰ و مقصود وحدتِ انسانیت تھا۔ قرآنِ کریم وہ واحد کتاب ہے جو اپنی اُس شکل میں اب بھی دنیا میں موجود ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس کو نازل کیا تھا۔ قرآنِ کریم، مکمل، محفوظ اور آخری کتاب ہے۔ قرآنِ کریم کے نزدیک تمام سابقہ انبیاء سچے تھے اور جو دین وہ لائے وہ بھی اللہ کی طرف سے تھا۔ لیکن اب وہی تمام دین اپنی مکمل شکل میں صرف قرآنِ کریم میں موجود ہے۔

نوٹ 2: عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب مختلف مذاہب کے پاس، ان کی (مبینہ) آسمانی کتابیں موجود ہیں تو پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ اب حق وصداقت کی راہ۔ صرف قرآن کریم کے اندر ہے اور کہیں نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کی کسی قوم کے پاس وہ کتاب اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں موجود نہیں جو ان کے دین کے داعی نے انہیں خدا کی طرف سے دی تھی۔ ان کتابوں کو انسانی تحریف نے کچھ کا کچھ بنا کر رکھ دیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بچوں کا صفحہ

تم بہت بہادر ہو

ارشد صاحب ایک سکول میں پڑھاتے تھے۔ وہ سچ مچ ایک استاد تھے۔ بہت سے پڑھانے والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ بس کلاس میں سبق دے دیا اور پھر لڑکوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ ارشد صاحب ایسے نہ تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو اچھی طرح سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرتے تھے۔ ظفر کو تقریر کرنے کا شوق تھا، ارشد صاحب نے اس کی ہمت بڑھائی اور اسے بتایا کہ تقریر کیسے کی جاتی ہے۔ مزمل کو تصویریں بنانے سے دلچسپی تھی، ارشد صاحب اس کے لیے تصویریں بنانے کی کئی کتابیں لائے۔ سلیم کو شعر یاد کرنے کا شوق تھا، ارشد صاحب نے ایک کاپی پر اسے بہت اچھے اچھے شعر لکھ کر دیے۔ ایسے شعر جن سے آدمی کو اچھے اچھے سبق حاصل ہوں۔

تم تو جانتے ہی ہو کہ ہر سکول میں اچھے لڑکے بھی ہوتے ہیں اور بُرے لڑکے بھی۔ بہت سے استاد بُرے لڑکوں سے نفرت کرتے تھے۔ ہمیشہ ان کی بُرائی کرتے تھے۔ مگر ارشد صاحب ایسے لڑکوں سے بھی پیار کرتے تھے۔ وہ کسی سے نفرت کرنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ اپنے ساتھیوں سے وہ اکثر کہتے تھے کہ تعلیم کا مقصد ہی یہ ہے کہ بُروں کو اچھا بنایا جائے۔ یہ کام بڑی محنت چاہتا ہے اور مدتوں بعد اس محنت کا پھل ملتا ہے۔

چھٹی جماعت میں ایک لڑکا تھا۔ اس کا نام فیروز تھا۔ وہ ہمیشہ سب سے بدتمیزی کرتا۔ نرمی سے بات کرنا تو جانتا ہی نہ تھا۔ ایک دن اپنی کلاس کے کسی لڑکے سے سڑک پر اس کی لڑائی ہوگئی۔ فیروز کہنے لگا:

''تم احمق ہو۔ جاہل ہو۔ تمہارے گھر والے بھی ایسے ہی ہیں۔''

اتفاق سے یہ باتیں ارشد صاحب نے بھی سن لیں۔ دوسرے دن جب وہ چھٹی جماعت میں پڑھانے آئے تو سبق شروع کرنے سے پہلے انہوں نے لڑکوں سے کہا:

''کل تمہارے ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو جاہل اور احمق کہا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے گھر والوں کو بھی بُرا بھلا کہا۔ تم سب ایک دوسرے کے بھائی ہو اگر تم دوسروں کی بے عزتی کرتے ہو تو اپنی ہی بے عزتی کرتے ہو۔''

''تعلیم اور شرافت کی ایک پہچان آدمی کی بات چیت ہوتی ہے۔ ادھر تم نے زبان کھولی اور ادھر پتہ چل گیا کہ تم کیسے انسان ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن شریف میں ہمیں حکم دیا ہے کہ ہمیشہ ایسی زبان بولو جو شریفوں کی زبان مانی جاتی ہو۔''

''قرآن شریف نے ہمیں گفتگو اور بول چال کے بارے میں اچھی اچھی باتیں بتائی ہیں۔ ہمیشہ صاف، سچی اور سیدھی بات کرو، جھوٹی باتوں سے ہمیشہ بچو۔ ہمیشہ اچھی اچھی باتیں کرو۔ جب بھی بات کرو انصاف کی بات کرو۔''

اور ہاں! بعض بچے اونچی آواز میں چیخ چیخ کر، چلا چلا کر باتیں کرتے ہیں۔ اس طریقہ کو آج پوری دنیا میں کہیں بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ گنوار اور جاہل لوگ چیخ کر باتیں کرتے ہیں۔ بہت پہلے قرآن شریف نے انسانوں کو بتایا تھا کہ اپنی آواز کو نیچا رکھو۔ سب سے بُری آواز گدھے کی ہوتی ہے۔''

''اچھا میرے بیٹو! یہ تو ہو گئیں کچھ کام کی باتیں۔ اب اپنا سبق شروع کرو۔''

ارشد صاحب نے مسکرا کر پڑھانا شروع ہی کیا تھا کہ فیروز اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا:

''جناب! مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔''

ارشد صاحب نے مسکرا کر کہا: ''ضرور ضرور۔۔۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔''

فیروز نے کہا: ''جناب! آپ نے آج جو کچھ کہا ہے میرے دل میں ایک ایک بات اتر گئی ہے۔ آپ نے مجھے شرمندگی سے بچانے کے لیے میرا نام نہیں لیا۔ کل میں نے ہی ارشاد کو برا بھلا کہا تھا۔ میں اپنے بھائی ارشاد سے آپ سب کے سامنے معافی مانگتا ہوں۔ انشاء اللہ اب میری کسی بات سے میرے کسی بھائی کو دکھ نہ پہنچے گا۔''

یہ کہتے ہوئے فیروز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ارشد صاحب نے آگے بڑھ کر فیروز کو گلے سے لگا لیا اور اس سے کہا: ''فیروز! تم بہت بہادر ہو۔۔۔ اپنی غلطی مان لینا سب سے بڑی بہادری ہے۔''

❁❁❁❁

خوشخبری

دروس القرآن کی جن جلدوں کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تھا وہ اب دوبارہ شائع ہو گئی ہیں۔

1۔ سورہ بنی اسرائیل، صفحات: 396 تقریباً، ہدیہ: 400 روپے

2۔ سورۃ الکہف و سورہ مریم، صفحات: 532، ہدیہ: 500 روپے

3۔ نیز سورۃ الاعراف کی نئی پہلی جلد چھپ کر آ گئی ہے۔ صفحات: 480، ہدیہ 500 روپے

سورہ الاعراف کی دوسری جلد جلد ہی تیار ہو جائے گی۔ سورہ یونس بھی دو ہفتے میں شائع ہو جائے گی۔

محمد علی صابر صدیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نوجوانوں کا صفحہ

نخلِ سینا

نشست نمبر 2

دوپہر کا وقت ہونے کو ہے کلیم الزمان معمول کے خلاف کھانے کے وقت سے پہلے کمرے میں آ بیٹھے ہیں وہ عالم آرا کو آواز دیتے ہیں۔

کلیم الزمان (سربراہ): بیٹی! آج کھانے میں کیا ملے گا۔ خوشبو تو بہت اچھی خبر دے رہی ہے۔ عالم آرا کلیم صاحب کے پاس آ کر کہتی ہے۔ ابو! پلاؤ پکا رہی ہوں، لیکن آج مجھ سے ایک غلطی ہوگئی ہے کہ مرغی کے قورمہ میں غلطی سے مرچیں زیادہ پڑ گئی ہیں اور شکیل صاحب کا مزاج پہلے ہی مرچیلا ہے۔ وہ زیادہ مرچیں پسند نہیں کرتے۔

کلیم الزمان: بیٹی! گھبرانے کی کوئی بات نہیں یوں کرو کہ پیاز کی ایک گٹھنی لو اسے گھی میں بھوننے کے بعد مسل کر ہنڈیا میں ڈال کر اوپر ایک لیموں نچوڑ دو۔ قورمہ کا مرچیلا پن ختم ہو جائیگا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون باورچی خانہ میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

عالم آرا (بہو): ابو! وہ کونسا قانون ہے؟

کلیم الزمان: بیٹی! قرآن مجید میں ایک تیر بہ ہدف نسخہ ہے جو ہر گنہگار استعمال کر سکتا ہے۔ اور وہ نسخہ تم سامنے دیوار پر دیکھ لو۔ دیوار پر ایک فریم میں لکھا ہوا ایک کتبہ آویزاں تھا اور اس قسم کے کتبے کلیم الزمان صاحب کے ہر کمرے میں لٹکے ہوئے تھے۔ انہیں ان کی ماضی کی یاد دلا رہے تھے اور لاشعور کے تہہ خانے سے کچھ یادیں اُبھر اُبھر کر انہیں سانپ کی طرح ڈس رہی تھیں۔ مگر کلیم صاحب ہر وقت ہر گھڑی ان اذیت ناک خیالات سے چھٹکارا پانے کی تگ و دو میں رہتے تھے۔ کتبہ میں لکھا تھا۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ (11:114)

کلیم الزمان کسی سوچ میں گم ہو گئے مگر عالم آرا کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ عالم آرا کے سوال کرنے پر کلیم صاحب نے کہا کہ میں نے صرف تمثیلاً یہ نسخہ بتایا ہے قورمہ میں مرچوں کا زیادہ ہونا غلطی تھی گناہ تھا لیکن پیاز اور لیموں میں جو نیکی یا خوبی موجود تھی اس نے مرچوں کا مرچیلا پن ختم کر دیا اور اللہ تعالیٰ کا یہ قانون پوری شدت سے ہر جگہ نافذ ہے اور یہی کیا معاشرے کا ہر قانون اخلاقی ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معیشت سے تعلق رکھتا ہو وہ قوانین فطرت کی طرح اٹل ہے۔ اگر غلطی کا برائی کا جرم کا، گناہ کا ازالہ وقت پر نہ کیا جائے تو دنیا اور آخرت کے عذاب سے بچا نہیں جا سکتا اور اگر اس قانون پر پورا پورا یقین ہو جائے تو غالب کے اس شعر کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں رہتی کہ ؎

اک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب　　خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

عالم آرا: ابو! کمال کر دیا ہے آپ نے مجھے غالب کے اس شعر کی آج سمجھ آئی ہے بات پلاؤ کی خوشبو سے چلی تھی اور غالب پر آ ٹھہری ہے۔ میری چھٹی حس یہ کہہ رہی ہے کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

کلیم الزمان (سربراہ): بیٹی! پردہ داری کی کوئی بات نہیں۔ پلاؤ کی خوشبو ہے جو میرے خیالات میں تلاطم پیدا کر رہی ہے۔ تم پوچھو گی کیسے؟ تو سنو۔ روایت ہے "دروغ برگردن راوی" کہ لاہور سے ایک رسالہ نکلتا تھا۔ جس کا ایڈیٹر انگریز تھا اور مجلہ بھی انگریزی زبان ہی میں شائع ہوتا تھا۔ یکا یک خبر آئی کہ فلاں انگریزی رسالہ کا ایڈیٹر مسلمان ہو گیا ہے۔ یہ زمانہ وہ تھا جسے علامہ اقبال کا زمانہ کہنا چاہیے۔ علامہ کی طبیعت میں تجسس بہت تھا۔ مذکورہ ایڈیٹر سے ملاقات کے دوران علامہ نے اس نو مسلم سے پوچھا کہ اس نے اسلام اور اسلامی تعلیمات کا مطالعہ تو کیا ہوگا۔ ایڈیٹر صاحب نے کہا کہ وہ تو اسلام کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ علامہ کی متجسس نگاہوں کو دیکھ کر اس نے کہا کہ وہ تو پلاؤ کھا کر مسلمان ہو گیا ہے۔ یہ سوچ کر کہ جس قوم کا کھانے کا مذاق اتنا لطیف ہے اس کا خدا کا تصور کس قدر لطیف ہوگا اور تم تو جانتی ہو کہ مسلمان گھرانوں میں پلاؤ مرنے کے بعد تک بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اکبر الہ آبادی نے خوب کہا تھا کہ ؎

تمہیں بتائیں کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

اور اس واقعہ کے برعکس شاید یہ برطانوی فلسفی کا قول ہے کہ تم مجھے یہ بتا دو کہ فلاں قوم نے کس قسم کا خدا پرستش کے لئے تجویز کر رکھا ہے تو میں اس قوم کی تہذیب و تمدن کا پورا خاکہ پیش کر دونگا۔ بیٹی! دیکھا کہ خدا تعالیٰ کے تصور سے انسان کی زندگی کا کیا تعلق ہے۔ ''لن ترانی'' کا شعلہ ہمیشہ نخل سینا پر ہی گرتا ہے۔

عالم آرا (بہو): ابو! اگر انسان ''رب ارنی'' کہے اور اسے ٹکا سا جواب مل جائے تو لن ترانی سننے کے بعد تو اسے چپ کر کے بیٹھ جانا چاہیے۔

کلیم الزمان: بیٹی! خدا تعالیٰ کو دیکھنا ضروری نہیں اور نہ ہی اسے طبیعی آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ اُسے پہچاننا ضروری ہے اور وہ قرآن مجید میں موجود اسمائے حسنہ کی مدد سے پہچانا جا سکتا ہے اور ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق اس کا تصور بھی قائم کر سکتا ہے۔

عالم آرا (بہو): ابو! یہ سب کچھ درست ہے جو آپ نے فرمایا لیکن اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ وہ ایسی ہستی ہے جس نے کائنات کو وجود بخشا۔ ساری کائنات ہمارے سمیت اس کی مخلوق ہے اور اسی کی عبادت کرتی ہے اور بس قصہ ختم۔

کلیم الزمان: بیٹی! حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اپنے اندر خدا تعالیٰ کے سے اخلاق پیدا کرو۔ یعنی اسمائے حسنہ ہمارے لئے ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ رحیم ہے تو تم بھی ایک دوسرے کے لئے رحمت بن جاؤ۔ وہ کریم ہے، تم میں بھی یہ صفت بہ حد بشریت پیدا ہو جانی چاہیے۔ وہ تواب ہے، بندوں کے چھوٹے موٹے قصور قانون کے مطابق معاف کر دیتا ہے۔ تم بھی ایسا اخلاق پیدا کرو۔ اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے ؎

موسیٰ نے کی عرض کہ اے بار الہ مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
فرمایا کہ بندہ ہمارا وہ ہے جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلہ

اور سنو بیٹی! اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی صفت اس کی خالقیت ہے وہ ساری کائنات کا خالق ہے اور اسکی تخلیق کا عمل ہر لمحہ، ہر گھڑی جاری رہتا ہے اور اسی کی وجہ سے کائنات میں ارتقاء کا عمل جاری ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ تم بھی عمل ارتقا میں خدا کے معاون بن جاؤ۔ چنانچہ فرمایا ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش براہ دیگراں رفتن عذاب است

گر از دستِ تو کارے نادر آید! گنا ہے ہم اگر باشد، ثواب است

مفہوم: اپنے ہی تیشہ سے اپنا راستہ بنایئے۔ دوسروں کے، بنے بنائے، راستے پر چلنا عذاب ہے۔ اگر آپ کے ہاتھ سے کوئی نادر اور انوکھا کام سرانجام پائے، اگر وہ کام گناہ کے زمرہ میں آتا ہو پھر بھی اپنی ندرت اور انفرادیت کے باعث ثواب کا مستحق ہوگا۔ (س۔ا)

ایک اور جگہ فرمایا ہے ؎

ہر کہ او را قوت تخلیق نیست نزد ماجز کافر و زندیق نیست

مفہوم: جس کسی کے پاس (کچھ نیا) تخلیق کرنے کی صلاحیت اور قوت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک وہ کافر اور زندیق ہے۔ (م۔س۔ا)

اور اس عمل تخلیق میں ندرت ہونی چاہیے۔ سورۃ اخلاص میں پہلی آیت ہے۔ قل ھواللہ احد جانتی ہو اس کا کیا مطلب ہے؟

عالم آرا (بہو): جانتی ہوں ابو اتنی سی عربی تو آتی ہی ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے مطلب ہے اللہ ایک ہے۔

کلیم الزمان: نہیں بیٹی! اس آیت کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ یونیق (Unique) ہے۔ لہذا تم جو کام بھی کرو اس میں انفرادیت ہونی چاہیے۔ یہ جو تم ہر روز آلو گوشت کھلا دیتی ہو (ہنستے ہوئے) قدرت کا عمل باورچی خانے میں بھی جاری رہنا چاہیے۔ اور ٹی وی چینل پر "مسالحہ" پروگرام دیکھ کر نہیں بلکہ تمہارا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ ؎

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد اب وہی اہل چمن کی بھی زباں ٹھہری ہے

سورۃ اخلاص کی دوسری آیت ہے۔ اللہ الصمد۔ اس کا مطلب آسان زبان میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات خود بخود قائم ہے اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ تو دوسروں کا سہارا ہے۔ یعنی اگر انسان دوسروں کے سہارے زندگی گزارے تو شخصیت میں اضمحلال آجاتا ہے۔ اسلئے انسان کی کوشش ہونی چاہیے کہ زندگی گزارنے کے لئے دوسروں کا سہارا نہ ڈھونڈھے۔ اگر کسی قوم کے افراد کو سہارے ڈھونڈنے کی عادت پڑ جائے تو اس پر گداگری کا ٹھپہ لگ جاتا ہے اور یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے۔ ذوق مرحوم نے اس خیال کو اپنے شعر میں اجاگر کرتے ہوئے فرمایا ہے ؎

نہ پکڑیں دامنِ الیاس گرداب بلا میں ہم کہ بدتر ڈوب کر مرنے سے ہے جینا سہارے کا

سورۃ اخلاص کی تیسری آیت ہے۔ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ (112:3) اس آیت کا سیدھا سادھا مطلب یہ ہے کہ خدا نہ کسی کی اولاد ہے اور نہ ہی کوئی اس کی اولاد، اور پھر اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اس کا جذباتی طور پر کسی کی طرف جھکاؤ نہیں۔ وہ اپنی ساری مخلوق کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ یہ ایک آنکھ میں محاورے کے طور پر استعمال کر رہا ہوں ورنہ خدا تعالیٰ طبعی طور پر آنکھیں نہ رکھنے کے باوجود بصیر ہے۔ یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ہمارے ساتھ ایک لڑکا پڑھا کرتا تھا۔ اس کا نام افضل حیات تھا۔ اس کے والد جوانی میں ہاکی کے کھلاڑی تھے۔ کسی حادثے میں ان کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی چونکہ ہاکی کھیلنے کا بے حد شوق تھا۔ اسلئے عمر ڈھلنے کے بعد وہ ہاکی کے میچوں میں ریفری کا کام سرانجام دیتے تھے۔ افضل حیات مزاحاً کہا کرتا تھا کہ میرا باپ بہت دیانتدار ہے ہاکی کے میچوں میں وہ دونوں ٹیموں کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مذکورہ ریفری کبھی کبھار زرد یا سرخ کارڈ دکھانا بھول جاتا ہو لیکن خدا تعالیٰ سے کبھی بھول چوک نہیں ہوتی۔ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ برآمد ہو کر

رہتا ہے۔ فٹ بال کے کھیل میں گول کیپر کو یہ استثناء حاصل ہوتی ہے کہ وہ گیند کو ہاتھ سے پکڑ سکتا ہے۔ لیکن انسانی معاشرے میں جو کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اس میں کسی کو بھی استثناء حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وہ فرشتہ جو انسانی معاشرے کی دیکھ بھال پر مامور ہے اور تعارف کے لئے جس کا میں نے اجماعیل القاہر نام رکھا ہے کسی کو نہیں بخشتا۔ یہ ریفری بھی ہر انسان کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کے قانون کی خلاف ورزی ہو رہی ہو خواہ غرباء کی جھونپڑیوں میں ہو یا امراء کے محلات میں، تو اس ریفری کے ریڈ کارڈ کی جھلک وہاں بھی پہنچ جاتی ہے۔ لیکن ہماری قوم کی شپرہ چشمی کی یہ حالت ہے کہ خدا تعالیٰ کے احکام کو بنی نوع انسان تک پہنچانے والی ہستی یعنی حضور نبی اکرم ﷺ تو یہ کہتے ہیں کہ اگر قانون الٰہی کی خلاف ورزی کروں تو میں بھی خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا ہوں یعنی ایک عام آدمی ہو یا خدا کا رسول ہو کسی کو بھی استثناء حاصل نہیں لیکن ہمارا دستور کہتا ہے کہ صدر مملکت کو کھلی چھٹی ہے کہ جو چاہیں کریں انہیں کوئی پوچھ نہیں سکتا۔ لیکن ہمارے ہاں تو خدا تعالیٰ کا تصور ایک منفرد تصور ہے جو تمہیں دنیا کے کسی مذہب کسی دین کسی فلسفہ میں نہیں ملتا اور یہ کہ ہمارے ہاں خدا تعالیٰ کو بھی استثناء حاصل نہیں۔

عالم آرا (بہو): ابو یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔ اللہ تعالیٰ تو جو چاہے کر سکتا ہے۔

کلیم الزمان: بیٹی! تم ٹھیک کہتی ہو۔ اللہ تعالیٰ جو چاہے کر سکتا ہے اور کرتا ہے لیکن اگر اس نے کوئی قانون بنا دیا ہے تو وہ خود بھی اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا اور اگر کسی کو بھی شکایت ہو تو وہ اس سے پوچھ سکتا ہے۔ اس نے خود سورۃ فرقان میں فرمایا ہے كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴿۱۶﴾ (25:16) تم اس سے پوچھ سکتے ہو کہ اللہ میاں! میں نے غریبوں کے لئے دس دیگیں پکوائی تھیں۔ ان میں پلاؤ بھی تھا، زردہ اور متنجن بھی، روسٹ بھی تھا اور بریانی بھی، پھر بھی میری مراد کیوں پوری نہیں ہوئی۔ میں کیوں الیکشن جیت نہ سکا۔ اس جواب میں اللہ تعالیٰ تمہیں بتائے گا کہ تمہاری مراد اسلئے پوری نہیں ہوئی کہ تم نے یہ سب کچھ غریبوں کے لئے نہیں کیا تھا۔ اپنے ووٹروں کیلئے رشوت تھی۔

دیکھا بیٹی! ہمارے ہاں اللہ کا کیا تصور ہے اور وہ کہتا ہے کہ اس کے متعلق تم جو تصور بھی قائم کر لو وہ اس سے بلند ہے۔ اس کی ذات انسان کے قیاس و وہم سے بالاتر ہے۔ اس کا تصور انسان کو حیرت زدہ کر دیتا ہے اور انسان مایوسیوں اور زندگی کی مشکلات میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ الغرض بنی نوع انسان کی آخری پناہ گاہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اور وہ سورۃ اخلاص کی چوتھی آیت کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بے مثل ہے۔ اسے کسی چیز سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾ (112:4) اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کی انفرادیت کا پہلو جھلکتا ہے۔

عالم آرا (بہو): ابو! سکولوں اور کالجوں اور مدرسوں میں تو قرآن مجید اس طرح نہیں پڑھایا جاتا وہاں تو بس قرآت پر زور دیا جاتا ہے۔ تلفظ ٹھیک کیا جاتا اور الفاظ کے معنی سمجھائے جاتے ہیں، یعنی لوگ جسے ترجمہ کہتے ہیں۔

کلیم الزمان: بیٹی! قرآن مجید صرف پڑھنے کے لئے نہیں ہے۔ اس کو پڑھ کر سمجھنا اور سمجھ کر اس پر عمل کرنا مقصود ہے۔ لیکن ہم نے اس معاملے میں نہایت غفلت شعاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ قرآن مجید کے ایک ایک لفظ میں معنویت کی دنیائیں آباد ہیں۔ صرف چشم بینا کی ضرورت ہے۔ اس وقت تو باورچی خانہ تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ کسی وقت تمہیں سمجھاؤں گا کہ علامہ اقبال نے یہ کیوں کہا تھا کہ ایں کتابے نیست چیزے دیگر است۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(قسط نمبر 9)

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

ہیگل کا نظریہ ارتقاء:

ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے حاملین کا موقف یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے ایک مستقل وجود رکھتی ہے اور ارتقاء کی رو سے اشیائے کائنات کی شکل وصورت میں ہی فرق پیدا ہوتا ہے، ان کی ذات (Essence) ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔ اس کے برعکس ہیگل کا نظریہ ارتقاء یہ ہے کہ اوّل تو کائنات میں مادہ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ مادہ کی بنیاد، تصورات (IDEAS) پر قائم ہے۔ اس لیے ہیگل کا نظریہ ارتقاء تصورات کے ارتقاء کی وجہ سے مشہور ہے۔ ہیگل نے وضاحت کی ہے کہ کائنات میں کوئی تصور، مستقل، ابدی، غیر متبدل یا جامد نہیں بلکہ ارتقا کے مراحل میں گزرتا رہتا ہے۔ دنیا میں کوئی قدر (Value) مستقل طور پر اپنا وجود نہیں رکھتی۔ ہر قدر میں نقص موجود ہوتا ہے۔ وہ تغیرات کی دنیا میں چکر کاٹتی ہے اور اس کے بعد ایک نئی قدر پیدا کرتی ہے جو اس کی ضد ہوتی ہے۔ یہ نئی قدر بھی اپنی ذات میں مکمل یا مستقل نہیں ہوتی، بلکہ ایک اور قدر کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ کائنات کی ہر شے کے اندر شروع سے اخیر تک، ہمیشہ دو متضاد عناصر موجود ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے محوِ پیکار رہتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک تصور منصۂ شہود پر آتا ہے۔ یہ مطلق یا مکمل صداقت کا پیکر نہیں ہوتا، بلکہ نیم صداقت کا حامل ہوتا ہے اس میں سے ایک اور تصور نمودار ہوتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے۔

اس عمل تغیر کی رو سے ایک شے، ایک ہی وقت میں، وہ شے بھی ہوتی ہے اور کچھ اور شے بھی بن رہی ہوتی ہے۔ ''بالفاظ دیگر'' اشیائے کائنات ہمیشہ وجود کوشی (Becoming) کے مرحلہ میں رہتی ہیں۔ (Being) مقام تک کبھی نہیں پہنچتیں۔ البتہ ایک شے کے اندر دونوں متضاد عناصر ایک دوسرے کی ضد (Opposite) ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے وجود کا سبب (Complimentary) بھی ہوتے ہیں۔ یعنی ان میں سے اگر ایک کا وجود نہ ہو تو دوسرا بھی موجود نہیں ہو سکتا۔ جیسے تاریکی نہ ہو تو روشنی بھی نہیں ہو سکتی۔ موت نہ ہو تو زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نیز یہ ایک دوسرے کی تکمیل کا موجب بھی ہوتے ہیں۔

ان دونوں باہمہ گیر متضاد تصورات کی کشمکش سے ایک تیسرا جنم لیتا ہے۔ یہ پہلے دونوں تصورات سے ارفع واعلیٰ ہوتا ہے لیکن ہوتا ہے پھر بھی نیم صداقت کا حامل۔ یہ تیسرا تصور پھر ایک نئی کشمکش کا قدم اوّل بنتا ہے اور جو نزاع پہلے سامنے آئی تھی،

اس قسم کی نزاع پھر وجود میں آ جاتی ہے۔ تضادات کی اس کشمکش کا نام ارتقائی طریق عمل ہے۔ یہ ارتقائی طریق عمل صرف اشیاء (Things) کے اندر کارفرما نہیں۔ بلکہ انسانی فکر اور معاشرتی وملکی نظام زندگی بھی اس قانونِ اضداد کے تابع ہیں۔ ان میں بھی اسی طرح باہمی تصادم اور سلسلہ تغیرات جاری وساری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ کُل تک پہنچے۔ یہاں پر سب تضاد مٹ جائیں گے اور ایک ایسی حقیقت دستیاب ہوگی جو مطلق ہونے کے علاوہ عالم گیر اور ہمہ گیر ہوگی۔ کُل پر پہنچ کر جدلیاتی ارتقائی عمل ختم ہو جاتا ہے۔ بالآخر ایسی ترکیب حاصل ہو جاتی ہے جو کسی جوابِ دعویٰ کے لیے دعوی نہیں بنتی اور ارتقاء کا عمل یہاں آ کر ختم ہو جاتا ہے۔

ہیگل کا تعمیری اور تخریبی ٹکراؤ سے ارتقاء کا نظریہ:

ڈارون (1809۔1882ء) نے تو صرف طبیعی زندگیوں کے متعلق تحقیق کی، لیکن ہیگل (1770۔1831ء) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ طبیعی زندگیوں میں جو ہوتا ہے وہ ٹھیک ہی ہوگا۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ تصورات Ideas، (جن کو قرآن کلمات کہتا ہے)، پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تصور جس کا نتیجہ تخریب ہوتا ہے اور دوسرا تصور جس کا نتیجہ تعمیر ہوتا ہے، ان دونوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس ٹکراؤ کو اس نے جدلیاتی Dialactic کہا ہے۔ دونوں کے ٹکراؤ میں تخریبی نظریہء حیات کو شکست ہوتی ہے اور تعمیری نظریہء حیات غالب آ جاتا ہے۔ غالب آنے والے نظریہء حیات میں مغلوب نظریہء حیات کے محاسن وخوبی شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ پہلے سے زیادہ نکھرا، صاف وشفاف آگے بڑھتا ہے۔ اس غالب نظریہ حیات میں سے ایک دوسرا مخالف نظریہء حیات ابھرتا ہے، جو زیادہ حسن وخوبی لیے ہوتا ہے۔ ان کا باہمی ٹکراؤ ہوتا ہے۔ زیادہ حسن وخوبی کا حامل نظریہ حیات غالب آ جاتا ہے۔ اس غالب نظریہ حیات میں بھی مغلوب نظریہ کے حسن وخوبی شامل ہوتے ہیں۔ یوں تعمیر وتخریب کے مسلسل باہمی ٹکراؤ سے نظریہ حیات ایک دن سچائی Truth یعنی حق تک پہنچ جاتا ہے۔

ہیگل کی وضاحت:

ہیگل نے ارتقاء کے نظریات کو فکری وحدت دینے کی کوشش کی اور کہا کہ کائنات ذہن کا ارتقاء ہے۔ نیچر سے عین مطلق یا خدا کی طرف عالم طبیعی اور ذہن انسانی میں ہر جگہ تدریجی انکشاف کا عمل جاری ہے، جسے اس نے جمالیاتی یا اصول تضاد کا نام دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

> ہر شے اپنی ضد کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ کائنات ایک کل ہے جس میں عقلی اصول کارفرما ہے۔ اس کل میں جو ارتقاء ہو رہا ہے جدلیاتی عمل سے ہو رہا ہے۔ پہلے ہم ایک شے کا انکشاف کرتے ہیں۔ جسے مثبت (Thesis) کہا جائے گا۔ پھر ہم اس کی ضد معلوم کرتے ہیں یعنی منفی (Antithesis)۔ ان دونوں کا اتحاد (Synthesis) عمل میں آتا ہے۔ جو بذاتِ خود مثبت بن جاتا ہے۔ یہ عمل اس طرح جاری رہتا ہے۔ جدلیات کا یہ عمل فکری ہے کیونکہ کائنات فکر ہے اور فکر ہی کے قوانین کے تابع ہے۔

جس طرح ہم فکر کرتے ہیں اسی طرح کائنات کا ارتقاء ہوتا ہے۔ یہ تمام عمل ایک فکرِ کُل ہے، جس میں نیچر اور انسان ایک ہیں جو عمل انسانی ذہن میں ہوتا ہے وہی نیچر میں پایا جاتا ہے۔ نیچر میں یہ علم لاشعوری ہوتا ہے جیسا کہ پودے کا پھل لانا۔ انسان میں یہ عمل شعوری ہوتا ہے اور انسان جانتا ہے کہ وہ ارتقاء پذیر ہے۔ یہی عمل ارتقاء ہر کہیں جاری ہے۔

اس کو عقل کا تجرباتی طریق Trial and Error بھی کہتے ہیں۔ یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے، جب غالب نظریہ حیات میں سے کوئی تخریبی نظریہء حیات نمودار نہیں ہوتا۔ جس نظریہ حیات میں سے کسی قسم کا تخریبی نظریہء حیات نمودار نہیں ہوتا، اسے خدا کی وحی انسان کو پہلے ہی قدم پر بتا دیتی ہے اور انسان لمبے لمبے سفر، تکالیف وصعوبتوں اور خونریزیوں سے بچ جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ وحی کی راہ نمائی کے بارے میں کہتا ہے کہ It Economises the Human Efforts۔

مارکس کے مطابق ارتقاء دراصل نظامہائے زندگی میں ہوتا ہے:

تصور یعنی کلمات ہی کو قرآن ایمان کہتا ہے، کیونکہ ایمان چند بنیادی نظریات وتصورات کی صداقت پر یقین کا نام ہے۔ جب تصورات عملی شکل اختیار کر جائیں، تو وہ دین کہلاتا ہے۔ اگر تصورات محض نظری طور پر رہیں تو یہ کچھ نتیجہ پیدا نہیں کرتے۔ دراصل نظریات یا تصورات ہی میں تعمیر وتخریب پوشیدہ ہوتی ہے۔ حق پر مبنی تصورات پر نظام قائم ہوا ہے، تو وہ ٹھوس تعمیری نتائج اسی دنیا میں برآمد کرے گا اور اگر باطل تصورات پر مبنی نظام قائم ہوا ہے، تو وہ ٹھوس تخریبی نتائج اسی دنیا میں برآمد کرے گا۔ نتائج اس بات کی شہادت ہوتے ہیں کہ نظام حق پر مبنی ہے یا باطل پر۔

قرآن کا جدید نظریہ ارتقاء پر تبصرہ:

قرآن کریم نے 1400 سال پہلے ہی تصورات اور نظام کا امتزاج پیش کیا۔ ہیگل صرف تصورات کو لے کر چلا۔ اس کا فلسفہ کچھ دیر رہنے کے بعد، بغیر نتائج کے جامد ہو کر ختم ہو گیا۔ کارل مارکس نے نظام کو لیا، لیکن جیسا نظام اس نے قائم کرنا چاہا، اس کے مطابق، اس کے پاس تصورات Ideas نہیں تھے، اس لئے اس کا نظام ختم ہو گیا۔ قرآن نے حقیقت پر مبنی غیر متبدل، ابدی تصورات (کلمات) دیئے، تو ساتھ ہی ان سے ہم آہنگ نظام بھی دیا۔ اس آیت میں دیکھیے وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ (42:24) میں بِكَلِمٰتِهٖ نظریات یا تصورات کے لئے آیا ہے۔ دین الحق، جو خدا کے عطا کردہ نظریات یا کلمات کے اوپر متفرع ہوتا ہے یعنی پھوٹتا ہے اسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ باقی رہے۔ قرآن کے تصورات پر مبنی نظام کی محسوس شکل کو دین الحق کہتے ہیں، جو اپنے تعمیری نتائج اسی دنیا میں برآمد کرتا ہے۔

قرآن یعنی الحق پر مبنی نظریات، خدا کی صفت الرحمان نے دیئے۔ صفت الرحمان میں انقلابی، فجائی ارتقاء Emergent Evolution پایا جاتا ہے، اس لئے عہد اولیٰ میں مسلمان انقلابی انداز میں آگے بڑھے یا قرآنی نظریات نے انہیں انقلابی انداز میں آگے بڑھایا۔ جب نظریات ہی قرآنی نہ رہے، تو پھر مسلمان وانتم اعلون یعنی سب سے بلند نہیں رہ

سکتے تھے۔ عہد اولیٰ میں نظام کے نتائج انقلابی انداز میں سامنے آئے۔ جب مسلمانوں نے قرآنی نظریات کو چھوڑ دیا، تو اسلام کائناتی رفتار Natural Evolution سے رواں دواں ہے، جہاں ایک ایک مرحلہ ایک ایک ہزار سال اور بعض مراحل پچاس پچاس ہزار سال میں طے ہوتے ہیں۔ کائناتی رفتار سے حق غالب آتا چلا جا رہا ہے اور باطل مغلوب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لہٰذا قرآنی نظریات فیل نہیں ہوئے، وہ آج بھی غیر محسوس انداز میں کائناتی رفتار سے آگے بڑھ رہے ہیں، البتہ مسلمان اپنے باطل نظریات کی وجہ سے فیل رہے گا، جب تک یہ قرآنی نظریات کی طرف لوٹ کر ایک نظام قائم نہ کرے۔ اگر آپ قرآن کے نظریات کے متعلق فلسفیانہ انداز میں کہیں کہ یہ بہت بلند ہیں، تو اس سے کچھ نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ یہ تو بغیر نظام کے ہیگل والی تفسیر ہوگی۔ نہ تو قرآن کے بالحق نظریات ہمارے ذہنوں میں ہیں اور نہ ہی ان پر ایک نظام کے اندر ہمارا عمل۔ تاریخ کا یہ فیصلہ ہے، اور قرآن تو جگہ جگہ اس کو شہادت کے طور پر پیش کرتا ہے کہ جب بھی کسی قوم نے ابدی اور غیر متبدل وحی کے ذریعے ملنے والے نظریات کو چھوڑا، وہ دنیا کی زندہ اقوام کی صف سے نکل کر پست و ذلیل و خوار ہوگئی۔ ثبوت میں آج کے مسلمانوں کی حالت کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

قرآن میں نظریہ ارتقاء کی وضاحت:

قرآن نے ارتقاء کے نظریہ کا بنیادی اصول درج ذیل آیت میں بیان کیا ہے، جو تفصیلی تجزیہ کا متقاضی ہے۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (32:5)

(خدا کا طریقِ تخلیق یہ ہے) کہ:

1۔ اِس کے عالمِ امر میں ایک اسکیم سامنے آتی ہے (يُدَبِّرُ الْاَمْرَ)، اور

2۔ اسکیم کے تکمیلی مراحل (مِنَ السَّمَآءِ) طے ہوتے ہیں۔

3۔ اسکیم کا آغاز، اُس کے پست ترین نقطہ (اِلَى الْاَرْضِ) سے کرتا ہے۔ اور

4۔ اسکیم اُس طے شدہ نقطۂ تکمیل (السَّمَآءِ) کی طرف قانون ارتقاء کی رو سے، عروج کرتی جاتی ہے (يَعْرُجُ اِلَيْهِ)۔

5۔ اِرتقائی منازل کی مدّت تمہارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے (فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ)۔

(دوسری جگہ 70:4 بتایا کہ بعض مراحل پچاس پچاس ہزار سال میں طے ہوتے ہیں)۔

اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۝ (70:4)

قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ نقطۂ آغاز کا وجود، یونہی اتفاق سے ظہور پذیر نہیں ہوا، بلکہ ایک سکیم (يُدَبِّرُ الْاَمْرَ) کے مطابق سامنے آتی ہے۔

اِس آیت میں یہ جو تدبر ہے اس کا مادہ ''د۔ب۔ر'' ہے، اِس کے لغوی بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی شے کا آخری حصہ۔

تدبر کے معنی ہوتے ہیں کسی شے کے آخر تک، نقطۂ تکمیل تک کی جو حالت ہے، اُس کو سامنے رکھ کر بات شروع کرنا۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ میں دبر کے معنی ہم نے دیکھ لئے۔

یہاں الامر سے مراد عالم امر ہے جس کے قرآن کے اصطلاحی مفہوم سے ہم آگاہی حاصل کر چکے ہیں۔ یہ خدا کی تخلیقِ کائنات کی پلاننگ اسکیم ہے۔

سماء کے معنی آسمان اور ارض کے معنی زمین لیتے ہیں، لیکن بنیادی طور پر سماء بلندی کو کہتے ہیں اور ارض پستی کو کہتے ہیں۔ یہاں اِس آیت میں ''یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ'' میں کہا گیا ہے کہ خدا پہلے ایک اسکیم کی تدبیر کرتا ہے، اور وہ اسکیم بلندی کے اوپر طے ہوتی ہے یعنی تخلیق سے پہلے، اسکیم کا تکمیلی نقطہ طے ہوتا ہے۔ وہ اُس کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے تاکہ امر (اسکیم) محسوس شکل میں سامنے آجائے، تو وہ امر جو سماء کی بلندیوں میں طے ہوا تھا، اُس کو پست ترین نقطہ (ارض) سے شروع کرتا ہے۔

آیت کا اگلا حصہ ''ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ'' ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ پھر پست ترین نقطہ سے جو وہ شے آغاز ہوئی ہے، تو وہ قانون ارتقاء کی رو سے، اِسے بلندیوں (السَّمَآءِ) کی طرف لے جاتا ہے۔ یہاں لفظ یَعْرُجُ جس کا مادہ ع رج ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ جس سے ہمارے ہاں لفظ عروج ہے۔ اِس کے معنی ہوتے ہیں کہ سیڑھیوں کے ذریعے اوپر چڑھنا، یعنی بتدریج، درجہ بدرجہ، بلند ہونا۔ اِسی مادہ سے لفظ معراج کے معنی سیڑھی ہوتے ہیں، یعنی یہ شے یکلخت کسی کو بلند نہیں کرتی بلکہ بتدریج بلند کرتی ہے۔

یَعْرُجُ لفظ کے بعد اِلَیْہِ میں یہ اِلیٰ جو ہے وہ سمت کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور اِلَیْہِ کی اِس ''ہ'' نے بات واضح کر دیا ہے کہ یہ وہ نقطۂ تکمیل ہے، جو اُس کے لئے طے کیا گیا تھا۔ اِس سے آیت کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ اِس شے کے آگے بڑھنے اور بلند ہونے کی جو سمت ہے، وہ اُس کے نقطۂ تکمیل کی طرف ہے، جو خدا نے اس کے لئے مقرر کیا تھا۔ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ میں ''ہ'' کی ضمیر مذکّر ہے، اس لئے ''ہ'' السَّمَآءِ مؤنث کے لئے نہیں آسکتی۔

لفظ ارتقاء کا مادہ ''ر۔ق۔ی'' ہے اور اِس کے معنی بلند ہونے کے ہوتے ہیں۔ سائنس کے انکشافات یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ زندگی کا نقطۂ آغاز پہلے جرثومہء حیات اور قرآن کی زبان میں نفس واحدہ سے ہوا ہے۔ ہزار ہا سال میں ارتقاء کا کہیں ایک مرحلہ طے ہوتا ہے۔ جرثومہء حیات ایک طویل عرصہ کے بعد، آگے بلندی کی طرف یعنی اپنے تکمیلی نقطے کی طرف بڑھا۔ آگے بڑھنے کے لئے قرآنِ کریم نے یہ بات کہی ہے کہ ہر شے کے راستے میں موانعات آتے ہیں، اور اُن کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے۔ جو شے موانعات سے ٹکراؤ میں غالب رہتی ہے، وہ زندہ رہتی ہے۔ جب راستے کے موانعات مغلوب ہو جاتے ہیں، تو شے ایک قدم آگے بڑھتی ہے، بہتر ہوتی ہے اور ساتھ ہی بلند بھی ہو جاتی ہے۔ اِسے قانونِ ارتقاء کہتے ہیں۔

قرآن اِس ضمن میں وضاحت کرتا ہے کہ:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿39﴾ (13:39)

''اللہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے باقی رکھتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اُس اُم الکتاب میں محفوظ ہے''۔

جو شے، (قوم یا نظریہء زندگی یا نظامِ حیات) قانون خداوندی کی میزان میں باقی رہنے کے قابل نہ رہے، تو وہ مٹ جاتا ہے، اور جو اپنے آپ کو قانون خداوندی کی میزان میں، محکم و استوار ثابت کر دے، وہ باقی رہتا ہے اور یہ محو و ثبات ان اصولوں اور قوانین کے مطابق ہوتا ہے، جو تخلیق کائنات کے ساتھ ہی اللہ نے عالم امر میں مقرر کر دیئے تھے۔

وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿39﴾ (13:39) اُمُّ کے معنی ہیں ''اصل و بنیاد''۔ تو وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿39﴾ کے معنی ہوں گے ''قوانین کی اصل ہمارے پاس ہے''۔ قوانین کس شکل میں یہاں کارفرما ہوتے ہیں، یہ تو ہم دیکھ سکتے ہیں، لیکن قانون کی اصل خدا کے پاس ہے، اور اس کا اصل قانون یہ ہے کہ حق ثابت رہتا ہے، باطل مٹ جاتا ہے۔ انسان جب قانون بناتے ہیں تو اس کی ایک اصل ہوتی ہے، جسے دیکھ کر کاپی کی تصدیق کی جا سکتی ہے کہ واقعی یہ کاپی اصل کے مطابق ہے۔ لیکن خدا کے قانون کی اصل عالم امر میں ہے، جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ خدا نے آخری ضابطہء قانون رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا اور پھر اس کو محفوظ رکھنے کا ذمہ بھی خود اٹھا لیا۔ اب کوئی بات خدا کے قانون یعنی قرآن کے مطابق ہے یا نہیں ہم قرآن سے اس کی تصدیق یا تردید کر سکتے ہیں۔ سابقہ انبیائے کرام کو دیئے ہوئے ضابطہء قانون کی حفاظت کا ذمہ خدا نے نہیں لیا تھا۔ ان قوانین کی اصل تو خدا کے ہاں ضرور ہوتی تھی، لیکن حفاظت کا بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے کچھ عرصہ بعد کسی بات کی تصدیق یا تردید نہیں کی جا سکتی تھی کہ فلاں بات خدا کے قانون کے مطابق ہے یا نہیں ہے۔

مٹانے اور باقی رکھنے کی اللہ کی مشیت کے اصول کی وضاحت بھی خود قرآن نے کر دی ہے کہ:

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ۭ (42:24)

''اللہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے قانون کے مطابق قائم رکھتا ہے''۔

یہ بات یہاں کے علاوہ دوسرے مقام پہ بھی ہے بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ (21:18) ''ہم باطل کے سر پر حق کی ضرب لگاتے چلے جاتے ہیں، تا آنکہ حق، باطل کا بھیجا توڑ دیتا ہے۔ نسلی مسلمان اپنے آپ کو حق پہ سمجھ کر ساری دنیا کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ باطل پہ ہیں، وہ مغلوب ہو جائیں گے، اور ساتھ ہی اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ حق و باطل کی کشمکش میں غلبہ انہی کو حاصل ہوگا۔ خود فریبی پر مبنی اس قسم کا اطمینان انسان کو دین الحق میں نہیں، مذہب ہی میں حاصل ہوتا ہے، کیونکہ مذہب ہے ہی جذبات کا نام۔ دین میں تو حق کے معنی ہیں ''حقیقت کا محسوس اور ٹھوس شکل میں سامنے آ جانا''۔ حق کوئی نظری یا ذہنی بات نہیں ہے کہ کسی کو نہ نظر آئے اور نہ ہی محسوس ہو، اور پھر بھی آپ، اپنے آپ کو حق پہ سمجھ کر خود فریبی میں مبتلا ہو جائیں۔ قرآن کریم کا ایک کلیہ ہے کہ حق اور باطل کی کشمکش کا سلسلہ اس کائنات میں طبیعی قوانین کی رو سے

ازخود جاری ہے۔ یہ کلیہ آج سے 1400 سال قبل قرآن نے بیان کیا جو آج کے معرکہ آرا نظریۂ ارتقاء کی بنیاد بنا۔

قرآن سے بتدریج ارتقاء کے نظریہ کی مزید وضاحت:

نظریۂ ارتقاء کی رو سے، زندگی ایک جرثومے (نفس واحدہ) سے چلی۔ یہ جرثومہ کروڑوں ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا، پیکرِ انسانیّت میں آیا۔ جب اوّلین جرثومے سے انسانی پیکر بے شمار تغیّرات کے بعد، آج کے مرحلے میں پہنچا ہے تو کیا حکمائے مغرب کے موقف کے مطابق ارتقاء کا سلسلہ ختم ہو گیا؟ جاندار اشیاء میں طبیعی ارتقاء، طبیعی قانون کے مطابق، طبیعی اشیاء کے جوہروں کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے، اور طبیعی موانعات کو دور کرنے سے مکمل ہوا۔ زندگی کی شاخوں میں سے ایک شاخ یعنی انسان نے مزید ارتقاء کے لئے اپنے آپ کو اہل قرار دے لیا، تو خدا نے طبیعی کی بجائے غیر طبیعی ارتقاء کا، اس کے لئے بندوبست کر دیا۔ اس کو خدا نے ''ذات'' عطا کی اور ساتھ ہی شعور بھی عطا کیا۔ ذات جس کی تفصیلی بحث اس کے متعلقہ عنوان کے تحت بیان کی جائے گی، چونکہ غیر طبیعی شے ہے، اور اب اسی کا ارتقاء مطلوب تھا اور ذات کا ارتقاء غیر طبیعی قوانین (اخلاقی قوانین) کا جوہر جذب کرنے سے ہی ہو سکتا تھا۔ غیر طبیعی جوہر اور غیر طبیعی قوانین، خدا نے وحی کی شکل میں عطا کر دیئے۔ اب نظریہء ارتقاء کی رو سے، اس کے لئے غیر طبیعی موانعات کی ضرورت بھی تھی، جن کو ہٹا کر یا جن کو مغلوب کر کے، اس نے ارتقائی منازل طے کرنی تھیں۔ غیر طبیعی موانعات خدا نے، انسان کے اندر، اِس کے بے باک جذبات کی شکل میں پیدا کر دیئے، جن کو شیطان یا ابلیس کہتے ہیں۔ جو شخص وحی کی روشنی میں اپنے شیطان و ابلیس کو مغلوب کر لے گا، مسلمان کر لے گا، اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے گی اور وہ ذات اخروی زندگی میں مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جائے گی۔

ارتقاء کے معنی اپنی موجودہ منزل میں، بلند ہو کر اگلی بلند اور بہتر منزل میں جانا ہوتا ہے۔ ذات کے ملنے کے بعد اب انسان میں طبیعی کی بجائے غیر طبیعی ارتقاء ہوگا مثلاً مراتب یعنی پوزیشن کا ارتقاء ہوگا۔ اب اوّلین جرثومہ (نفس واحدہ) سے دیکھیے کتنے تغیرات اور ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد انسانیّت آج کے پیکر میں پہنچی ہے، تو خدا سابقہ ارتقاء کو شہادت میں پیش کرتا ہے کہ یہ طبیعی ارتقاء ہمارے اُس قانون کے مطابق ہوتا رہا ہے، جو کبھی غلطی نہیں کرتا، تو اے انسانو! تم سے متعلق غیر طبیعی ارتقاء والے قوانین کیا اب غلطی کریں گے؟ انسان کا ارتقاء چلتا رہے گا، لیکن ارتقاء کی آخری منزل خدا کے علم میں ہے۔

انسان کے بتدریج ارتقاء کے متعلق قرآن کا اصول ہے کہ:

وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾ (71:14)

اور اس نے تمہیں مختلف حالات سے (گزار کر) پیدا کیا۔

اور دوسری جگہ یوں کہ:

19۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ (84:19)

کہ یہ کائناتی مظاہر اور اِن میں نظر آنے والی تبدیلیاں، اس حقیقت کی شہادت دیتی ہیں کہ تم بھی زندگی کی ارتقائی منازل سے مطابقت کرتے ہوئے، درجہ بدرجہ (دنیا و آخرت میں) مراتب کی بلندیوں کی طرف اٹھتے چلے جاؤ گے۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ کی وضاحت:

ہم انسان کو اسی طرح منزل بمنزل، طبقاً طبقاً، درجہ بدرجہ اوپر چڑھاتے چلے جائیں گے۔ انسان اپنے ارتقاء کی جہت سے جمود کے مقابلے میں گھوڑے کا شہسوار ہے۔ اس آیت میں ''طَبَقٍ'' ہے اور اس کے بعد ''عَنْ'' آیا ہے۔ ''عَنْ'' کے اندر تحفّظ یا محافظت ہوتی ہے۔ ''طَبَقٍ'' جب کوئی شے محافظت کے ساتھ، اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہو جائے، اس میں ثبات آ جائے یا وہ اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کر لے، تو وہ بچ رہتی ہے، اور آگے بڑھتی ہے۔ اگلی منزل میں جانے سے پہلے، موجودہ منزل سے مطابقت پیدا کرنا، ارتقاء کے لئے ضروری ہے۔ جب موجودہ منزل سے شے ہم آہنگ ہو جاتی ہے، تو اس میں اگلی اور بلند منزل کی طرف اٹھنے کے لئے توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔ ''لَتَرْكَبُنَّ'' کے بعد شے نے اگلی اور بلند منزل کی طرف چڑھنا ہوتا ہے۔ شے جب اگلی منزل کے ساتھ مطابقت پیدا کرتی ہے، تو پھر وہ مزید اگلی اور بلند منزل کی طرف اٹھ جاتی ہے۔ یہی کچھ اخروی زندگی کے ارتقاء میں ہوگا۔ انسان نے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔

اس کی وضاحت میں قرآن کریم ہی کا ارشاد ہے کہ:

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾ (71:17)

''اور اللہ نے تمہیں زمین سے سبزہ کے طور پر اُگایا۔''

یعنی زندگی کے یہ جراثیم مختلف نوعوں میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخوں کی طرح بڑھنے پھولنے لگے۔ سلسلہ ارتقاء کے ماہرین جب مختلف انواعِ حیات کو سمجھاتے ہیں تو وہ اسے درخت کی شکل میں ہی پیش کرتے ہیں۔

اسی تدریجاً ارتقاء کی وضاحت میں سورۃ الانعام میں ہے۔

قرآنی اصطلاحات مستقر اور مستودع سے بتدریج ارتقاء کی وضاحت:

انہی مراحل اور منازل کے متعلق قرآن نے مستقر اور مستودع کے الفاظ سامنے لائے ہیں۔ قرآن کے نظریہ ارتقاء کی روشنی میں انسان کی ارتقائی منازل کے لیے اس تدریجاً ارتقاء کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن نے یہاں جو اصطلاحات استعمال کی ہیں خصوصاً مستقر اور مستودع اُن کا جائزہ لیا جائے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾

(6:98)

خدا وہی ہے، جس نے تم کو نفس واحدہ (اوّلین جرثومہء حیات) سے پیدا کیا۔ پھر ہر زندگی کے لئے ایک مستقر (عارضی ٹھہرنے کی جگہ) ٹھہرائی، اور پھر اگلے مرحلے میں سونپے جانے کے لئے ایک مستودع ٹھہرایا۔ ہم نے اپنے قوانین کو نکھار کر

بیان کر دیا ہے، اُن کے لئے جو سمجھ اور سوچ سے کام لیتے ہیں۔

ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف ارتقاء کے مراحل کو مستودع و مستقر کہا گیا ہے۔

مستقر کے معنی ہیں ''کسی متحرک شے کا چلتے چلتے کسی نقطہ پر آ کر رک جانا۔'' مستقر سے ہی قرار لفظ ہے۔ اور قرار کہتے ہی اس چیز کو ہیں کہ جس میں پہلے حرکت ہو اور پھر وہ رک جائے۔ جس میں حرکت نہ ہو اس کے لئے یہ لفظ آتا ہی نہیں ہے۔

مُسْتَوْدَعٌ ط :

متحرک شے دراصل ایک منزل میں امانت ہوتی ہے، جب شے کو اگلی منزل کو سونپ دیا جائے، تو اس سونپے جانے کو شے کا مستودع کہتے ہیں۔ متحرک شے، مثلاً زندگی، طبیعی زندگیوں پر مبنی سامان زیست کو اپنے اندر جذب کرتی اور طبیعی موانعات کا مقابلہ کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہوئی نتیجہ خیزی کے لئے ایک مقام پر ٹھہرتی ہے۔ اس ٹھہرنے کے مقام کو زندگی کا مستقر کہتے ہیں۔ اگر زندگی نے مزید آگے بڑھنے کے لئے اپنے اندر وہ طبیعی قوت مدافعت و محافظت مہیا نہیں کی ہے، جو اگلے مرحلہ یعنی مستودع کے موانعات کو مغلوب کر سکے، تو وہ زندگی اپنے ہی مستقر کی نوع بن کر رہ گئی۔ اگر زندگی نے اگلے مرحلے یعنی مستودع میں جانے اور آگے بڑھنے کے لئے طبیعی قوت مدافعت و محافظت حاصل کر لی ہے تا کہ اگلے مرحلے کی موانعات کو مغلوب کر سکے، تو زندگی اگلے مرحلے یعنی مستودع کے سپرد ہو جاتی ہے۔ اس سپرد کیے جانے یعنی Promotion کو مستودع کہتے ہیں۔

نظریہء ارتقاء کی بنیاد، اس حقیقت پر ہے کہ زندگی جامد شے نہیں ہے، متحرک ہے اور یہ کہ زندگی کا ارتقائی سفر عمودی نہیں بلکہ صعودی ہوتا ہے یعنی جس طرح ہوائی جہاز زمین سے مطلوبہ بلندی پر پہنچنے کے لئے پرواز کرتا ہے یہ صعودی سفر ہوتا ہے۔ زندگی اپنے اوّلین جرثومہء حیات، قرآن کی زبان میں نفس واحدہ سے حرکت کرتی ہوئی، آگے بڑھی ہے۔ لیکن اس نے مسلسل حرکت نہیں کی۔ یہ ایک منزل میں آ کر، ایک وقت کے لئے نتیجہ خیزی کے لئے رکتی رہی ہے۔ یہ رکنے والا مقام طبیعی زندگی کا مستقر کہلاتا ہے۔ ٹھہرنے سے قبل، از خود جاری و ساری طبیعی قوانین کے مطابق ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ زندگی کو، طبیعی قوانین کے مطابق، طبیعی زندگیوں پر مبنی سامان زیست (توانائی) کو اپنے اندر جذب کر کے اگلے مرحلہ، جو پہلے والے سے بہتر اور بلند ہوتا ہے، کے لئے وہ مطلوبہ قوّت مدافعت و محافظت بہم پہچانا ہوتی ہے، جو اگلے مرحلہ (مستودع) کے موانعات کو مغلوب کر سکے۔ اگلے مرحلے کے لئے مطلوبہ قوّتِ مدافعت و محافظت بہم پہنچانے کو قرآن کی زبان میں زندگی کا اپنے اعمال صالح کا پلڑا جھکانا کہتے ہیں۔

خدا کا قانونِ طبیعی انتخاب Law of natural selection اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ شے نے مطلوبہ مقدار میں قوّت مدافعت و محافظت یا اپنے اعمال صالح کا پلڑا جھکا لیا ہے یا نہیں یعنی زندگی کی شاخ نے وہ قوّت بہم پہنچا لی ہے جو اگلی منزل کی موانعات کو ہٹانے کے کام آ سکے اور اگلی منزل کے طبیعی سامان زیست کو جذب کر سکے، تو موجودہ منزل یا مستقر اس شے کو اگلی مگر بہتر اور بلند منزل کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہ سپرد کیا جانا یا اگلی منزل میں پہنچ جانا مستودع کہلاتا ہے۔ یہ مستودع پھر سے ایک خاص وقت کے لئے اس زندگی کا مستقر بن جاتا ہے اور اس مستقر میں زندگی اگلے مرحلے میں جانے کی تیاری کرتی

ہے۔ یہ مستودع یعنی Promotion پھر سے شے کا مستقر بن جاتا ہے۔ اپنے مستقر میں شے کو پھر سے طبیعی سامان زیست استعمال کر کے اگلے مستودع کے لئے مطلوبہ قوّت مدافعت ومحافظت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ خدا کا قانون طبیعی انتخاب فیصلہ کرتا ہے کہ شے کو اگلے مرحلے میں سونپا جائے یا مطلوبہ قوّت بہم نہ پہنچانے کی وجہ سے اس کو اسی منزل میں روک لیا جائے۔ جو زندگی کی شاخیں مطلوبہ قوّت مدافعت ومحافظت حاصل نہ کر پائیں، وہ زندگی کی اُسی منزل کی نوع بن کر رہ گئیں۔ قرآنی زبان میں یوں سمجھیئے کہ وہ زندگی، اپنے اعمالِ صالحہ کا پلڑا نہ جھکا سکنے کیوجہ سے، اپنے مستقر کی نوع بن کے رہ جاتی ہے۔ ایسی زندگیاں اپنے اپنے جہنّم میں ہوتی ہیں لیکن اس کا شعور نہیں ہوتا۔

طبیعاتی غیر جاندار سے حیوانی جاندار کے بعد اِس باب میں نظریہ ارتقاء کا خصوصی طور پر حیوان سے انسان کا طبیعی ارتقاء زیرِ بحث لایا جارہا ہے اب تک ہم نے نظریہ ارتقاء کے حوالہ سے آغازِ کائنات سے لے کر آدمی کی طبیعی شکل میں نمودار ہونے تک کا جائزہ لیا ہے۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ آگے بڑھنے سے پیشتر دونوں حیوانی زندگی اور انسان کی طبیعی زندگی میں جو نمایاں فرق نظر آتا ہے، اُس پر اِس باب میں روشنی ڈالی جائے۔ اِس میں پہلے حیوان اور انسان کے فرق کو نفسیاتی موضوع ''احساس'' کے عنوان سے واضح کیا گیا ہے۔ حیوان میں صرف احساس کی صفت ودیعت کی گئی ہے جبکہ انسان کو احساس کے ساتھ سادہ شعور کی قوت بھی ودیعت کی گئی ہے۔ اس سے پہلے کہ نفسیات کی زبان میں انسانی شخصیت (ذات) کا جائزہ لیا جائے، بہتر سمجھا جاتا ہے کہ نفسیات کے علم کی رو سے انسان اور احساس کی اصطلاح سے آگاہی حاصل کر کے بات کو آگے بڑھایا جائے۔

انسان کا مفہوم:

انسان کا لغوی ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:

یہ مادہ انس سے نکلا ہے جس کے معنی مانوس ہونے کے ہیں۔ انسان چونکہ فطرتاً کچھ اس قسم کا واقع ہوا ہے کہ اس کی زندگی کا مزاج باہم انس اور میل جول کے بغیر نہیں بن سکتا اس لیے اسے انسان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اسی بناء پر یہ کہا گیا ہے کہ انسان طبیعی طور پر متمدن واقع ہوا ہے۔ کیونکہ وہ آپس میں میل جول کے بغیر نہیں رہ سکتا اور نہ ہی اکیلا ضروریات زندگی کا انتظام کر سکتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اسے جس چیز سے محبت ہوتی ہے اس سے مانوس ہو جاتا ہے اس لیے اسے انسان کہا جاتا ہے۔ انسان کا مترادف لفظ بشر بھی بولا جاتا ہے جس کے معنی انسان کی جلد کی سطح اور دوسرے مترادف لفظ ''آدم'' کے معنی باطنی سطح کے ہیں۔ اس کے علاوہ لغات میں لفظ انسان کے متعلق بہت سی توجیہات پیش کی جاتی ہیں لیکن اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ انسان اور بشر مترادف معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

اس کے مترادف لفظ بشر کے متعلق تصریح پائی جاتی ہے کہ بشر سے صرف انسان کی طبعی ساخت اور جسمانی بناوٹ مراد ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ہر انسانی بچہ بشر ہوتا ہے۔ لیکن انسانیت کے جوہر اور خصوصیات ہر بشر میں مختلف ہوں گے۔

انگریزی میں لفظ انسان Mankind کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس کے لغوی مفہوم بنی نوع انسان: آدم زاد، نوع انسانی، نوع بشر، نسل انسان لیے جاتے ہیں۔ (جاری ہے)

The Sunrise of Humanity

(*Tulu-e Aftaab* طلوع آفتاب)

[*Meraj-e Insaaniyat* (The Pinnacle of Humanity) *by* G. A. Parwez]

(Translated by: M. Alam)

For ages I wailed in Kaaba and in idol-temples for the advent of Life!
That, from among the community of devotees, a visionary might come!

Prophet Ismail (PBUH) had 12 sons. His second son *Qedaar* (قیدار) became quite well known and prominent among them. He settled in Hijaz and became the custodian of Kaaba that was built by Ibrahim (PBUH) and Ismail (PBUH). Prophet Ismail's descendants over time became a large community. They spread and expanded into large number of different tribes. The clan of *Quraish* (قریش) occupied the most superior and a unique special status among all the tribes.

Meaning of Quraish

Quraish (قریش) was the nickname of *Fahr* (فہر) (circa 325 A.D.), the son of *Qedaar* (قیدار). There are many meanings of word *Quraish* (قریش). The king of ocean, the whale, is also called *Quraish* (قریش) in Arabic. It is speculated that *Fahr* (فہر) kept this nickname because of his power and status. Among the Qureshi clan *Qasi Ibn Kalaab* (قصی ابن کلاب) (circa 475 A.D.) gained special fame because he laid down the political structure of this clan. He divided the management of Kaaba into different areas: arranging food and drink for pilgrims; creating security structure for Kaaba; instituting a system for pilgrims' financial help; creating a judicial system for resolving disputes; and establishing an assembly for political consultation and making collective decisions for running the affairs of *Quraish* (قریش). After *Fahr* (فہر) the next person that occupied a famous place among *Quraish* was Hashim. He was a gifted leader and fulfilled his duty as a great custodian of Kaaba. He signed treaties with Caesar of Rome and king Najashi of Abyssinia for tax exemption for Quraish's caravan passing through their territories. His son Abdul Muttalib (circa 550 A.D.) was also a great leader of Quraish who discovered the Zamzam well (that had disappeared over time) and restored it. He married his son Abdullah to Amina (daughter of Wahb bin Abd Manaaf) a well-respected lady of the clan of Zahra among the Quraish.

A radiant sun is born

In this respected and distinguished family, in the season of spring, on Monday, the ninth of Rabi-ul-Awwal (corresponding to April 20, 571 A.D.), in the

morning, was born the sunshine of the world who was to remove all its darkness. Abdul Muttalib, the grandfather – the baby's father had passed away before the birth his son – carried his beloved grandson in his arms to the courtyard of Kaaba and prayed for him. On the seventh day he invited his entire clan for dinner and named the baby Muhammad. People asked in surprise why he chose this name instead of traditional family names. He replied that I want my grandson to be worthy of praise and admiration of the whole world and this name reflects that status. The mother of the baby called him Ahmad.

In those days it was the tradition that babies were given in the custody of Bedouin families so that babies could grow up in open desert environment and develop clear and commanding speech. Powerful oratory was a great characteristic of the Arabs. According to this custom the Prophet's initial upbringing happened in the famous tribe of Bani Saad. When the Prophet was six years old his mother also passed away and the grandfather took his custody.

The period before Prophethood

Books of history and hadith provide good deal of details of the pre-prophetic life of the Prophet (PBUH). (Even non-Muslims admit the fact that the details of our Prophet's prior life are also preserved in history books.) However, the Quran puts more emphasis on his life as a messenger after he became the Prophet (PBUH) and provides *its* details – rather than providing his pre-prophetic life's details. This is because he conveyed the divine guidance of light to humanity. And he preached that guiding light to humanity that created an extraordinary revolution in the world of humankind. The Quran presents powerful evidence as far as his pre-prophetic life is concerned. And that evidence is so profound and comprehensive in capturing the Prophet's entire pre-prophetic life that it is as if the sky has been placed inside the pupil of the eye. We will come to it little later and provide details.

But first let us see what kind of society it was in which the Prophet (PBUH) was born and raised as a child and attained adulthood.

In a nutshell, the society in which the Prophet (PBUH) was born and raised was drowned in *Shirk* (شرک) and idol-worship. The Kaaba in which Abdul Muttalib took his beloved grandson and prayed for him, had hundreds of idols while his family was its chief custodian.

This was the environment in which the Prophet (PBUH) grew up. But he disliked all practices of *Shirk* (شرک) that were prevalent those days and always shunned them. In one instance he was given food in which the meat was from an animal that was sacrificed in the name of an idol. But he refused to eat that food [Bukhari – Book of *Almunaqib*]. Leave aside these major issues like

Shirk (شرک) and *Kufr* (کفر), the Prophet (PBUH), in his pre-prophetic life, shunned even incidents which were quite common among the Arabs at that time. In those days, the Arabs went to the extent of taking their clothes off while doing circumambulation of Kaaba, and didn't feel any shame in doing so. The Prophet (PBUH) was growing up in such an evil society but these pre-Islamic evil customs and traditions could not touch his life. Once in his childhood, during the repair of Kaaba, he was also bringing load of bricks along with other people. Considering that his shoulder will be bruised, his uncle Abbas thought to pull the young child's pajamas and put it on his shoulder. But the moment he tried to undo his pajamas the Prophet (PBUH) became unconsciousness. When he gained consciousness he kept asking where is my pajamas, where is my pajamas? And his uncle immediately put his pajamas back on him. When the young child turned to adulthood he was so shy that, according to his companions, he was shyer than a virgin girl [Bukhari, Book of Good Manners].

Avoiding unjust bloodshed

Tyranny and bloodshed was a common feature of Arab life during those days. But there was one soul among them who was untouched by all that unjust bloodsheds. Well, who could have been that personality except the one who would be the prince of peace and security (PBUH) for humanity? His nonparticipation in these internecine tribal wars was not due to cowardliness but because these battles were based on ignorance, barbarism, and prejudices of tribalism. In his entire pre-prophetic life the Prophet (PBUH) only took part in just one battle which occurred between the tribe of Quraish and the tribe of Qais in which the Quraish were right. But since the battle took place during the period of the sacred months he didn't physical hurt anyone. In fact, his participation turned out to be the cause of peace and security because some people from the Prophet's family had a change of heart and wanted to reform the society. This led to a peace treaty between these two tribes. The treaty said that victims of tyranny will be given shelter and tyrants would not be allowed to live in Mecca. The Prophet (PBUH) participated in the negotiations for this treaty.

The Prophet (PBUH) used to mention this event with pleasure and just pride during his prophetic life. And it was of course a matter of being justly proud because this was the first time that the principle of "helping a victim" – no matter which tribe the victim came from – was publicly recognized as a common goal. This was a great achievement considering that ignorance and prejudice generally prevailed in those days in Arab society. This treaty was known as the "Pledge of Grace" (حلف الفضول); though the Arabs themselves

broke this pledge later due to their vengeance and ethnic prejudices against none other than the Prophet (PBUH) himself when he started inviting people to Allah's revelation. Nevertheless, this treaty was a praiseworthy effort at reforming the Arabian society. It failed because it was done to avert a crisis without reforming the people involved with proper education and training. This task was to be done by the Prophet (PBUH) later during his prophetic life.

The messenger of peace and harmony

It is worth noting how the Prophet's visionary thinking and practical strategies diffused contentious issues among different tribes even before his prophetic life which otherwise would have led to bloodshed as they usually did on these occasions. One striking example of this is the occasion when the repair of the Kaaba was going on where all the tribes were participating. Although its custody was under the jurisdiction of Quraish but in matters related to Kaaba they usually involved other tribes as it was a sacred house to all. So, when, after the repair, the question came up to fix the black (حجر اسود) the tribes started fighting among themselves about who should put the black stone in the wall of the Kaaba. This issue was worth fighting for – and even dying for – since the black stone represented their ultimate sublime connection to Kaaba. So, the swords were drawn out. This dispute went on for four days. On the fifth day it was decided that whoever will enter Kaaba the next morning first, he will be accepted as the arbitrator. The next morning it was the Prophet (PBUH) who happened to be the first one to enter the Kaaba. He was the one then to resolve this dispute now – and eventually destined to resolve the disputes of larger humanity later. Well, here is how he resolved the dispute at hand. He spread his blanket on the ground and put the black stone in its middle. He asked the leaders of all the tribes to lift the blanket and carry it to the Kaaba. When they did reach the walls of Kaaba lifting the blanket by their hands, then he picked the black stone in his hands and fixed it in the wall of the Kaaba. And thus the bloodshed at hand was avoided with this beautiful strategy of the Prophet (PBUH); and every tribe was happy that they participated in this sacred duty.

***

Sound and honest dealings

The economy of Quraish was based on commerce. So, when the Prophet (PBUH) reached adulthood he became involved with commerce. In a very short time his fame as an honest and trustworthy person spread in the community. And, everyone wanted to involve him in one's business. The books of narrations and history are full of reports of his honesty and trustworthiness. This was the reason he was given the nickname of Amin (امین)

or trustworthy by the people. At that time there were no banks. So, people were in search someone trustworthy and honest to entrust their holdings; and invariably their sight landed on the Prophet (PBUH) – even before he was endowed with Prophethood – and they looked up to him for this task of safekeeping of their trust.

Khadijah (May Allah be pleased with her)

This was the pre-prophetic character attribute of the Prophet (PBUH) that attracted the attention of Khadijah, a highly respected and pious lady of Quraish so much so that she was called Tahira (meaning pious) even during the period of *Jahiliyyah* (ignorance). She sent the proposal of marriage to the Prophet (PBUH). She had already been married twice and was a widow. There was no shortage of young beautiful woman for a handsome young man with such wholesome and pure character from the elite family of Hashim. But the Prophet (PBUH) accepted this proposal based on Khadijah's piety and character. And thus his married life began, which remained an unparalleled and unique model of beautiful companionship and peace and harmony until the end. Khadijah was already wealthy businesswoman before her marriage to the Prophet (PBUH). And since the Prophet (PBUH) was recognized for his honesty and integrity among the entire community, Khadijah's business flourished even more. The Quran has pointed this out when it says: وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنٰى ۝ (93:8) – He found you needy and gave you much, thus making you secure, independent, and self-sufficient. But in spite of this wealth, the Prophet (PBUH) lived an average life of a common mediocre family. He was never counted as elite among his people. That is why when he became the Prophet (PBUH) one of the criticisms from the opponents was: why wasn't an elite chosen for this mission? وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ (43:31) – Now consider the objection they raise against him. They say that why was the Quran not revealed to some leading man from either of the two cities (Makkah or Taif)? How can we accept that a poor orphan has been selected to become a Messenger, leaving aside all our leaders and rich people? How can we obey such a person?

***

Life itself as proof of truth

These, in brief terms, are some of the important events of pre-prophetic life of the Prophet (PBUH). As mentioned before, books of hadith and history are full of descriptions and details of his previous life. But the Quran, instead of providing details, has provided such a clear and comprehensive answer about his previous life that there is really no need for details for reaching conclusive evidence about the truth of his pre-prophetic life.

After the Prophet (PBUH) declared his prophethood, a storm of opposition arose from all corners of the Arab world. People started asking for proof that he was indeed a messenger of Allah. Do you know what proof the Prophet (PBUH) gave them in answer to this question? Listen – and please pay deep attention to this proof because after this proof there remains no need for any other proof! People ask you, O Prophet (PBUH), how can they accept that you are truthful in your claim of prophethood? The Prophet told them: that I have not come from outside; that I am from amongst you – فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (10:16) – Indeed, a whole lifetime have I dwelt among you before this revelation came unto me: will you not, then, use your intellect and reason? If this revelation had not been from Allah, I would have neither conveyed it to you, nor brought it to your knowledge; and in order to prove that I am not telling a lie and to show what kind of a person I am, I produce a proof that is so powerful that there is no need to say anything else after this. I have lived amongst you all my life before this revelation came to me. Can't you understand this much? Is my life not a living proof of my truth? Could you point even a single incident from my life that its truth you doubt in my entire 40 years of life of which every moment has been spent in front of you? Can you find even a trace of malevolence in my entire life?

This challenge was given to the entire Arab nation consisting of all the tribes and no one said anything against it. What could be better proof to his opponents than this: if someone presents his entire life's record as a proof of the truthfulness of his claim – and his opponents couldn't point any fingers against him? This proof was presented not just to Quraish only, but it is in front of the whole world since 1400 years ago. And the proof of the truthfulness of Prophet's claim stands vindicated since until today no one – not even his enemies – could belie it. Instead, they had to accept the piety of Prophet's character. Such a prejudiced orientalist as Sir William Muir was forced to say that: "Our authorities all agree in ascribing to the youth of Muhammad a correctness of deportment and purity of manners rare among the people of Mecca." Page 19, The Life of Mahomet, Abridged New Edition, London; Smith, Elder & Co., 1877.

This was the introduction to the Book of Life which was to become *the* Model of Life, for Eternity, by ascribing a new interpretation to life.

***

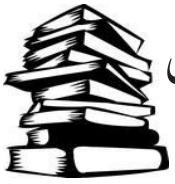
It should also be made clear that before a person is chosen to receive revelation from Allah he doesn't have any prior knowledge about it. Therefore, "the correctness of deportment and purity of character" comes from the person's own intrinsic merit and abilities. There is no help in this of any supernatural or

extrinsic power.

Even after being chosen messenger of Allah – i.e., after receiving the code of guidance from Allah – a Prophet leads his life according to that guidance by his *own* efforts and by his own 100% devotion and commitment to the divine code. And this is what he encourages others to do. The *decisions* he makes in this world to lead life in the light of that divine code of guidance are solely the results of his own efforts (*Ijtihad*). His actions of practical life are reflections of his own intentions and desires. There are no external forces involved in these actions or intentions. Thus the human life of Prophet is just like the life of any other human being – except that he gets the divine guidance from Allah which he faithfully and truthfully conveys it to others. Therefore, the Prophet's purity of character comes from his own intrinsic efforts and abilities. There is no help or support in this of any supernatural authority. It is these, his own intrinsic merits and personal qualities in pre-prophetic life, which qualifies him to be considered for divine selection as a messenger and prophet – in order that he could achieve the higher purpose of life for humanity.

This fundamental point must be kept in mind when studying the life and character of the Prophet (PBUH). This is what makes his life as a role-model for other human beings: that they can also achieve these character traits – what the Prophet (PBUH) was able to achieve – in their own personalities provided they follow the same principles and values in their own life as the Prophet (PBUH) followed in his life.

کراچی کے احباب کے لیے ضروری اطلاع



اب طلوع اسلام کی تمام بکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین مندرجہ ذیل پتہ پر مل سکتا ہے



محمد اقبال

48 سی، 21 کمرشل اسٹریٹ، میزانین فلور، فیز 2، ایکسٹینشن ڈی ایچ اے، کراچی رابطہ نمبر: 021-35395702, 0300-2275702

آصف جلیل

نالج اینڈ ویزڈم سنٹر، سلمان ٹاورز، آفس نمبر A-45، بالمقابل نادرا آفس، ملیر سٹی، کراچی رابطہ نمبر: 021-35421511,0333-2121992

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	زیر طبع		سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	زیر طبع		سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطّور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

(ب) انسانی ذات میں یہ صفات بطور ممکناتِ زندگی مضمر یا خوابیدہ شکل میں ہوتی ہیں۔ان کو مشہود یا بارآور (Actualise) کرنا ہوتا ہے۔

(ج) صفات خداوندی کے جذبات سے بلند، منزا اور مبرا ہونے کے بالمقابل، انسانی صفات میں جذبات کا دخل ہوتا ہے۔شہودِ صفات سے پہلے جذبات پر پورا پورا کنٹرول کرنا لازمی امر ہوتا ہے۔

5- انسانی زندگی کا مقصود یہی ہے کہ ان صفاتِ خداوندی کو معیار بناتے ہوئے ہر ممکن استعداد سے انہیں اپنے اندر منعکس کیا جائے۔جوں جوں انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے وہ خدا کا قرب حاصل کرتا ہوا اس کے رنگ (صبغۃ اللہ) میں رنگا جاتا ہے۔اس طرح وہ خدا کے تخلیقی پروگرام میں شریک ہوتا جاتا ہے اور خدا اور بندے کا تعلق رفاقت کا ہو جاتا ہے جس میں بہرحال خدا رفیق اعلیٰ ہوتا ہے۔

6- صفاتِ خداوندی کی انسانی ذات میں نمود سے جوں جوں اس کی نشوونما ہوتی جاتی ہے، یہ اس کے ایمان اور سیرت میں مزید پختگی کا باعث بنتی ہے۔اس طرح وہ ارتقائی مراحل سے گذرتے ہوئے حیات بعد الممات کا امیدوار بننے کے قابل ہو جاتا ہے تاکہ اس مقام کے حصول کے بعد وہ مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کی صلاحیت حاصل کر سکے۔

7- صفاتِ خداوندی متعدد اور متنوع ہونے کے علاوہ بعض مقامات پر، باہم گر متضاد بھی ہیں۔مثلاً وہ رحیم و کریم بھی ہے اور جبار و قہار بھی۔ذات (کیریکٹر) کے معنی یہ ہیں کہ جس جگہ جس قسم کی صفت کی نمود ضروری ہو وہاں اس صفت کا ظہور ہو اور حسنیٰ کے تحت اس قدر ظہور ہو جس قدر اس موقع پر اس کی ضرورت ہو۔اگر غفور و رحیم کی صفات کے اطلاق ہونے کے مواقع پر قہاریت و جباریت کی صفات کا ظہور ہو جائے تو اس سے نظامِ عالم میں اصلاح کی بجائے فساد برپا ہو سکتا ہے۔

8- انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ایسی شے نہیں جس کے متعلق دوسرے کو کچھ علم ہی نہ ہو سکے۔ان صفات کا اظہار، انسان کی سیرت و کردار میں ہوتا ہے، جو مرئی اور محسوس شکل میں ہر ایک کے سامنے آ جاتا ہے۔اسی کو انسان کا کیریکٹر کہتے ہیں۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 70
ISSUE
11

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

